نوبہاراں

(۱۹۳۹ سے ۱۹۵۶ تک کی منتخب غزلوں کا مجموعہ)

اثر لکھنوی

دانش محل ۔ امین الدولہ پارک لکھنؤ

طبع اوّل .. .. جون سنہ ۱۹۵۷ء

قیمت .. .. دو روپئے چار آنے Rs. 2/8/-

ناشر .. .. دانش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ

طابع .. .. سرفراز قومی پریس لکھنؤ

سنہ ۱۹۳۹ء

مجھ کو ہلاک جلوۂ سرشار دیکھ کر — اوجھل ہوا وہ آنکھ سے اک بار دیکھ کر
تھا مژدۂ بہار، پیام شکست رنگ — دل خون ہوگیا گُل و گلزار دیکھ کر
اکثر مآل دید سے بیگانہ ہو گئے — نقش و نگار پردۂ اسرار دیکھ کر
بے اختیار اہل وطن یاد آگئے — باہم سلوک آبلۂ و خار دیکھ کر
کہتا ہے رشک یہ بھی کسی کے ہیں منتظر — ذرّوں پہ نقش دیدۂ بیدار دیکھ کر
پھولوں کا بس نہیں کہ قدم بڑھ کے چوم لیں — اک نوبہار ناز کی رفتار دیکھ کر
کوچے کا اُس کے ہے یہ پتا جان بے قرار — آتی ہے نیند سایۂ دیوار دیکھ کر
کیا کیا تھا ناز حُسن پہ ماہ تمام کو — مر مر گیا وہ پھول سے رخسار دیکھ کر

توبہ اسی کا نام ہے کیوں میرزا اثر
ملتے ہو ہاتھ خانۂ خمار دیکھ کر

گل اور اُن کا گلہ اے دل فگار نہیں — نہیں، نہیں، مرے بسمل ترے نثار نہیں
یہ کس نے شوق میں یوں پے بہ پے کیے سجدے — کہ رہگزر میں کہیں نقش پائے یار نہیں
ندیم اس کی ندامت کا ہے خیال مجھے — میں کیونکر اُس [illegible] کہوں [illegible] وفاشعار نہیں

بہار ایکی یوں ہی مفت گزری جاتی ہے — جنوں ہے اور گریباں میں ایک تار نہیں
چمن ہے اُن کے شہیدوں کے خون سے رنگیں — بہار تم جسے سمجھے ہو وہ بہار نہیں

وہی سُنے جو دلِ دردمند رکھتا ہو
یہ ہے اثر کی غزل نغمۂ ہزار نہیں

سُرور دل میں نہیں، آنکھ میں خمار نہیں — تو بات کیا ہے کہ زاہد شراب خوار نہیں
یہ سچ ہے آپ نے تازہ ستم نہیں توڑا — مگر کچھ آج طبیعت پہ اختیار نہیں
نظر فروز ہو صبح بہار کے مانند — نگاہِ شوق کو اب تاب انتظار نہیں
کچھ اس سے کر مری محرومیوں کا اندازہ — کہ ناگوار بھی اے دوست ناگوار نہیں
بہار لالہ و گُل پر تھا خندہ زن اک دن — وہ دل کہ جس سے اب اک داغ یادگار نہیں
خراب بادہ و وہم و خیال ہے دنیا — خدا ہے دور خودی سے کوئی دوچار نہیں
ترے جمال کی محروم ہوئی ہے جب سے نظر — بہار آئینۂ رنگ ہے بہار نہیں

ملا ہے مبدءِ فیاض سے اثر مجھکو
وہ دل کہ جس میں کدورت نہیں، غبار نہیں

وفا سے میں تو جفا سے وہ شرمسار نہیں — کسی کے دل پہ کسی کا کچھ اختیار نہیں
وہ دل نہیں وہ تمناؤں کی پکار نہیں — سلوک یہ تجھے زیبا خیالِ یار نہیں
صفائے حُسن سے حُسن صفا کو کیا نسبت — کنار آئینہ آئینہ کنار نہیں
نظارہ خون تمنا سے گُل بداماں ہے — چمن ہے بھولنے والے کا انتظار نہیں

ترے نثار وہی خندۂ حجاب آلود   مری نظر ابھی آسودۂ بہار نہیں

تمام ہوش ہے مستی تمام مستی شوق   مذاقِ عشق میں گنجائشِ خمار نہیں

سمجھ لے اپنی جگہ جو بھی جس کا جی چاہے

اثرؔ ہے کون اثر پر بھی آشکار نہیں

جہانِ عشق میں ضرب المثل ہے گفتگو میری   نہیں سنتا نہیں سنتا فسوں گر ایک تو میری

پھر اُس کے بعد جو گزرے یہ حسرت ہے کہ دم بھر کو   مرا دل تیرا دل ہو اور تیری خو ہو خو میری

جو سمجھا یا کسی کو پیٹھ پیچھے کچھ نہیں کہتے   اسی دن سے بدی کرتا ہے میرے روبرو میری

نظر جب پھیر لی تو نے تو پُرساں کون ہوتا ہے   نگاہیں جا رہی ہیں بیکسانہ چارسو میری

مجھے برباد تو کرتا ہے لیکن یاد رکھ اتنا   رہے گی مدتوں تیرے ستم کو جستجو میری

خزاں کا ڈر نہیں جس کو میں وہ نخلِ تمنا ہوں   محبت جب تپاتی ہے تو ہوتی ہے نمو میری

وفا شیوہ مرا اور تو وفا کے نام کا دشمن   نہ چھوڑی تو نے خو اپنی نہ چھوٹی مجھ سے خو میری

صدائے بازگشت اپنی سنی ہے متصل اتنی   کہ مجھ میں ہو گئی محدود آخر جستجو میری

اثرؔ جن کو قبولِ عام حاصل ہے مبارک ہو

فقط اہلِ نظر کے واسطے ہے گفتگو میری

جلوہ گر تو ہی جو اے رشکِ مہِ کامل نہیں   لاکھ ہو آراستہ آراستہ محفل نہیں

چشمِ ساقی نے نہ جانے کیا اشارہ کر دیا   محفلِ تصویر ہے مستوں کی اب محفل نہیں

اللہ اللہ پھر بھی تیری جستجو کی لذتیں   گو یہاں جادہ ہی جادہ ہو کہیں منزل نہیں

وہ جو اک سرگرمیوں کا لطف تھا جاتا رہا
اور کچھ افسوس اسے محرومیٔ حاصل نہیں

عافیت دشمن ہوئی ہے خود تلاش عافیت
رخصت اے دل اب تمہی منزل مری منزل نہیں

ہو مبارک تجکو اے پروانے پھرنا گرد سر
جس کا میں پروانہ ہوں کس شمع سر محفل نہیں

کتنے ہی اسرار ہیں تعمیر میں پنہاں اثر
گو بظاہر آدمی جز نقش آب و گل نہیں

حقیقت بے نیاز کفر و دیں معلوم ہوتی ہے
تری غفلت ہی جو غیر آفریں معلوم ہوتی ہے

بقدر شورش دل ہے کسی کی جلوہ آرائی
کہیں محسوس ہوتی ہے کہیں معلوم ہوتی ہے

شفق آلود غنچہ ہو کہ گل ہو شبنم آلودہ
مجھے تیری ادائے شرمگیں معلوم ہوتی ہے

حذر اُن ترچھی نظروں سے پناہ ایسے تبسم سے
رگ جاں موج سیل آتشیں معلوم ہوتی ہے

در جاناں پہ جب سجدے میں جھک کر سر اُٹھاتا ہوں
قلمرو حسن کی زیر نگیں معلوم ہوتی ہے

کھپایا سر بہت کچھ عقل و ہوش و فہم و دانش نے
حقیقت جس جگہ پہ تھی وہیں معلوم ہوتی ہے

جسے سننے کی خاطر گوش بر آواز ہے عالم
محبت ہی وہ حرف دل نشیں معلوم ہوتی ہے

نہ جانے بات یہ کیا ہے تمہیں جس دن سے دیکھا ہے
مری آنکھوں میں دنیا پھر حسیں معلوم ہوتی ہے

ذرا تو بھی تو سن سچ ہے کہ میرے کان بجتے ہیں
قدم کی اُن کے آہٹ ہم نشیں معلوم ہوتی ہے

یہاں دل تھا کبھی ہاں ہاں تڑپتا دل دھڑکتا دل
جہاں اب ایک آواز حزیں معلوم ہوتی ہے

کہاں تک خون اپنوں کا بہاؤ گے وطن والو
لہو میں ڈوبی اک میت زمیں معلوم ہوتی ہے

تجھے بھی کیا نہیں ہے اذن سجدہ صبح کے تارے
اثر کی طرح افسردہ جبیں معلوم ہوتی ہے

آخر کار یہی عذرِ جفا کا نکلا — جرم اور جرم بھی اک عمرِ وفا کا نکلا

اوس میں ڈوب کے جس طرح نکھرتا ہے گلاب — شرم سے اور سوا حسن ادا کا نکلا

کیا کریمی ہو کہ جب در پہ ترے آ بیٹھا — آستیں سے نہ کبھی ہاتھ گدا کا نکلا

جو دعا مانگی وہ اوروں ہی کی خاطر مانگی — حوصلہ آج مرے دستِ دعا کا نکلا

شوقِ منزل ہی لئے اٹھ گئے جانے والے — آشنا ایک نہ آوازِ درا کا نکلا

جب تو ہی تو ہے تو پھر غیب و حضوری کیسی — ایک ہی رنگ بقا اور فنا کا نکلا

عشق کیا ہے ادب آموزِ فنا ہو جانا — اور فنا قیدِ تعین سے رہا ہو جانا

بحر سے ملنے کی تقریب نہیں اس کے سوا — صورتِ موجِ رواں بے سر و پا ہو جانا

شورشِ عشق بڑھے لذتِ آزار کے ساتھ — یوہیں اس درد کا ممکن ہے دوا ہو جانا

ان کی پرسش ہو گوارا اگر اے غیرتِ عشق — تو ذرا دیر کو پہلو سے جدا ہو جانا

دیکھ کر غنچوں کو دل خون ہوا جاتا ہے — مسکرانا ہے لبِ زخم کا وا ہو جانا

عشق خود اپنی تمناؤں کا شیدا ہو جائے — حسن کو آئے جو مانوسِ وفا ہو جانا

تم خزاں کہتے ہو در اصل ہے تکمیلِ بہار — رنگ و بوئے چمنستان کا ہوا ہو جانا

کیا ملے بحر سے وہ قطرہ نہ آیا جس کو — اپنے ہی شوق کے طوفاں میں فنا ہو جانا

جب میں جانوں کہ جفا کو بھی وفا سے بدلو — شوخیوں کا تو سکھایا ہے حیا ہو جانا

کھینچتے یوں بھی ہیں بیتابیٔ دل کا نقشہ — موج کا موج سے مل مل کے جدا ہو جانا

کچھ نہ ہوتے بھی محبت میں بہت کچھ ہے اثرؔ
کاہشِ درد کا اندوہ رُبا ہو جانا

دیکھتے سب ہیں رُخِ عاشقِ دلگیر کا رنگ — دیکھتا کوئی نہیں اس بُتِ بے پیر کا رنگ
سونپ حرماں کو نہ سرمایۂ ہمت اے دل — میں نے دیکھا ہے بدلتے ہوئے تقدیر کا رنگ
ہر بُنِ مو سے لہو پھوٹ نکلنے کو ہے — رحم اے دل یہ ہے اب نالۂ شبگیر کا رنگ
کامیابی پہ نہ خوش ہو کہ بہت ممکن ہے — یہ بھی درپردہ ہو اک گردشِ تقدیر کا رنگ
کم نگاہی سے تری اب ہے یہ دل کا نقشہ — جیسے ہو آب زدہ کاغذ تصویر کا رنگ
زمزمۂ غم سے نہ کیوں ساز محبت چھیڑے دل — دردمندی میں ہے صد گونہ مزامیر کا رنگ
آج للہ ہنس ہنس کے مرے دل کو دکھا — اور ہے آہ کا رُخ اور ہے تاثیر کا رنگ
ریختے میں ہوئے ہر رنگ کے شاعر لیکن — رنگ میں رنگ ہے بس میر تقی میرؔ کا رنگ

کیوں لُبھاتے ہیں تجھے نقش و نگارِ ہستی
بے ثباتی ہے اثرؔ دہر کی تعمیر کا رنگ

دل مائلِ فریاد ہے معلوم نہیں کیوں — ناشاد سا ناشاد ہے معلوم نہیں کیوں
ہر جہد کا اقدام کا یا جبر کا حاصل — اک فطرتِ آزاد ہے معلوم نہیں کیوں
میں شوق سراپا ہوں محبت ہوں سراپا — مجھ پر تری بیداد ہے معلوم نہیں کیوں
انسان جسے "احسنِ تقویم" کہا ہے — مجموعۂ اضداد ہے معلوم نہیں کیوں
دنیائے محبت کی تباہی کا خلاصہ — اک محشرِ برباد ہے معلوم نہیں کیوں

فرہاد کی محنت کا صلہ وائے مقدر　　خونِ سرِ فرہاد ہے معلوم نہیں کیوں
جو نالہ گزرتا تھا سرِ عرش سے اک دن　　مہرِ لبِ فریاد ہے معلوم نہیں کیوں
ہے ہے وہ سُنا کر مجھے اک شوخ کا کہنا　　دیکھو جسے ناشاد ہے معلوم نہیں کیوں
سب کچھ تو اثر بھول گیا جوششِ جنوں میں
کہنا ترا بس یاد ہے" معلوم نہیں کیوں

نہ ہو لطفِ بیداد بھی کم نہیں　　سلامت رہو تم مجھے غم نہیں
دلِ زار کا اب وہ عالم نہیں　　جگر خوں نہیں آنکھ پُرنم نہیں
تجھے کوئی چاہے کس اُمید پر　　جفا کا بھی پیماں محکم نہیں
جدھر آنکھ اُٹھی چمن کھل گیا　　تمناؤں کا اب وہ عالم نہیں
دکھالائی ہے بارہا بے خودی　　وہ عالم جہاں کوئی عالم نہیں
نہ پوچھے کوئی حال اور کہہ چلیں　　اب ایسے گئے گزرے بھی ہم نہیں
اثر مرنے جینے کا پھر کیا مزا
وہ رسمِ اُلفت جو باہم نہیں

سرگشتگانِ شوخیٔ گفتار کیا کریں　　پوچھے وہ دل کی بات تو انکار کیا کریں
مانا کہ دل پہ جبر کیا ہونٹ سی لئے　　ظالم نگاہِ شوق کا طومار کیا کریں
انجامِ کار سو گئے ادراک و عقل و ہوش　　مستِ مئے خیال کو ہشیار کیا کریں
اُٹھا جدھر قدم بس اُدھر چل کھڑے ہوئے　　دیوانے امتیازِ گل و خار کیا کریں

ممکن نہیں کہ جادۂ تحقیق ترک ہو ۔۔۔ گمراہ مجھکو سبحہ و زنار کیا کریں
حور و قصور و خلد جسے چاہے بخش دے ۔۔۔ یہ تحفے تیرے طالبِ دیدار کیا کریں

جو اپنے ہمصفیر تھے رخصت ہوئے اثر
رنگیں نوائیاں سرِ گلزار کیا کریں

یہ تو نہیں کہ حال پہ میرے نظر نہیں ۔۔۔ ہے لیکن اس طرح کہ مجھے بھی خبر نہیں
تیغ کشیدہ ہر نفس ناکشیدہ ہے ۔۔۔ اُٹھ جو سوئے دل نگہ فتنہ گر نہیں
انجام کار تیری طرف بازگشت ہے ۔۔۔ ہے کون رہگزر جو تری رہگزر نہیں
کس منھ سے شکوہ سنج ہو وعدہ خلاف کا ۔۔۔ وہ انتظار کش جسے اپنی خبر نہیں
میری نگاہ شوق سے کوئی چھپا تو کیا ۔۔۔ آئینۂ خیال میں کب جلوہ گر نہیں
ترسا ہوا ہے دیدۂ دیدار جو ہنوز ۔۔۔ جلوہ نمائیاں تری اک رنگ پر نہیں
نیرنگِ حسن دوست ہے نیرنگ ماسوا ۔۔۔ دھوکا ہو جس کو غیر کا میری نظر نہیں
ہوتا ہے مجھ پہ ختم ہر اک رازِ کائنات ۔۔۔ آئینہ بھی تو آپ ہی آئینہ گر نہیں

کیا جانئے وہ آنکھ ملاتے نہیں ہیں کیوں
یہ کہہ کے "تیرا عشق اثر معتبر نہیں"

پہلا سا جذب تجھ میں اب اے چشم تر نہیں ۔۔۔ جو کھینچتی تھی پھول سے رس وہ نظر نہیں
اے ضبطِ شوق کیا یہی تیرا مآل تھا ۔۔۔ سرمایۂ نشاط اب آہِ سحر نہیں
اک محویت ہے اور دلِ امیدوار ہے ۔۔۔ دنیائے انتظار ادھر کی ادھر نہیں

تو ہی بتا کہ چوٹ سی لگتی ہے دل پہ کیوں
گو پنکھڑی ہے پھول کی تیری نظر نہیں

کہتے ہو کب سکوت ہوا ترجمان دل
اللہ کیا اب اتنی بھی تم کو خبر نہیں

میری شب فراق ہے ایسی شب فراق
ہمسائے میں بھی جس کے سحر کا گزر نہیں

جب اور کوئی عیب نہ نکلا تو کہہ دیا
"سب کچھ سہی کلام اثرؔ میں اثر نہیں"

نکلتے ہیں وہ پہلو خود نہ تھا جن کا گماں مجھکو
ملی ہے مبدء فیاض سے ایسی زباں مجھکو

یہ ممکن ہے کہ یاد آجائے پھر بھولی فغاں مجھکو
ذرا سی لادے اے صیاد خاک آشیاں مجھکو

اگر میں خاک بھی ہوں گا تو میری خاک کو دیگی
کیا ہے برق حسن یار نے آتش بجاں مجھکو

سکوت شب کے پردے میں دل فطرت دھڑکتا ہے
نیا عالم دکھاتا ہے مرا ضبط فغاں مجھکو

ستم دلکش ستم سے بڑھ کے یہ عذر ستم دلکش
کہ تھا مد نظر تیری وفا کا امتحاں مجھکو

سزا ہے بیدلی کی یا ستم تیرے تغافل کا
بہار گل سے بھی آنے لگی بوئے خزاں مجھکو

شب غم ختم ہونے پر اداسی ایسی چھائی تھی
کفن میں لپٹی میت کا سحر پر تھا گماں مجھکو

دیار دوست سے پیغام پر پیغام آتے ہیں
متاع درد کا ایسا ملا ہے کارواں مجھکو

بقدر خواہش دل تھی بہار جلوہ آرائی
محبت نے دکھایا ہے اک ایسا بھی جہاں مجھکو

نوید امن ساحل بھی سبب ہے سرگرانی کا
یہاں تک موج طوفاں دے چکی ہو لوریاں مجھکو

دیار آگہی گزرا سواد بے خودی آیا
یہاں سے دیکھئے لیجائے جذب دل کہاں مجھکو

اثرؔ اب عشق و مستی ہے بلندی ہے نہ پستی ہے
خردمندی نے رکھا تھا اسیر این و آں مجھکو

نگہِ شوق کو یوں آئینہ سامانی دے
عشق کو حُسن بنا حُسن کو حیرانی دے

دلنوازی میں بھی ایذا ہے محبت کی قسم
تجکو فرصت جو کبھی شغلِ ستمرانی دے

کچھ تری چشمِ سخن ساز کا ایسا نہ کُھلا
لبِ نوشیں کو تکلیفِ گُل افشانی دے

پُھول وہ ہے جو میسر چڑھے یہ سنتا تھا
اب کھلا دل کی رہِ عشق میں قربانی دے

آئنہ سنگ درِ دوست ہوا بھی تو کیا
سر جو سجدے میں جھکے تو تری پیشانی دے

اُف وہ پُرکار جو سُنتے ہی تغافل کا گلہ
عشوۂ و ناز کو تعلیمِ پشیمانی دے

دلِ بیتاب تماشا کی تسلی معلوم
اپنے ہر جلوے کو اک پیکرِ انسانی دے

اُس کی انگڑائی کا عالم تو کبھی دیکھ اے گُل
اور ہی حُسن تری چاکِ گریبانی دے

آ دُشیرازۂ ہستی کو پریشاں کردیں
یوں کہ اُس زلف کو پیغامِ پریشانی دے

تیری سرکار غنی تیرا گدا بھی ہے غنی
کچھ نہ دے اور جو دے غم کی فراوانی دے

اس توقع پہ ہوں خاموش کہ وہ شوخ نگاہ
پھر ٹھوکا پئے تقریبِ غزل خوانی دے

بات نکلی منہ سے آفت ہو گئی
کس ستمگر سے محبت ہو گئی

چُپ رہو تو پوچھتا ہے "خیر ہے؟"
لو خموشی بھی شکایت ہو گئی

میری جانب آتے آتے وہ نگاہ
میری ہی برگشتہ قسمت ہو گئی

کس طرح آخر تجھے سمجھائیے
کی نہیں ناصح محبت ہو گئی

یاد کر لے بھولنے والے مرے
اب تو بچھڑے ایک مدت ہو گئی

ہے اُسی درجے میں تیرا ناز بھی　　جتنی عالی جس کی فطرت ہو گئی
آبگینے کی طرح ڈھلتا ہے شعر　　اس قدر نازک طبیعت ہو گئی

آپ اور دعویٰ محبت کا آثرؔ
آپ کی بھی اتنی ہمت ہو گئی

منسوب تجھ سے ہوتی کج کلاہی　　تیرے فقیروں نے کی بادشاہی
یہ شب یہ طوفاں "یہ کشتی تباہی"　　اور دستگیری کو بے دستگاہی
یہ جوش گریہ سے ہے رنگِ عصیاں　　کرنوں کے حلقے میں جیسے سیاہی
نا آشنا ہے جو نقشِ قدم سے　　اُس منزلِ بے نشاں کا ہوں راہی
ممکن اگر ہو تو ہو تیرے ہاتھوں　　مجکو گوارا ہے اپنی تباہی
انسان جب تک ہو انسانِ اُمّہ　　ہے وہم ہی وہم عصمت پناہی
دیکھا نہیں اور تلوار برسی　　ابرو ہیں تیرے وہ بپھرے سپاہی
اتنی ہو مخمور اے چشمِ جاناں　　پھولوں میں تلنے لگے خوش نگاہی

کہتا وہی اور کرتا وہی ہوں
دیتا ہے جس کی آثرؔ دل گواہی (۱)

خوابِ غفلت کی گرانی ہے وہی　　ہم وہی مدام کہانی ہے وہی

---

(۱) اس غزل کا وزن فعلن (ع ساکن) فعولن فعولن فعولن ہے (دو بار) اُردو میں کوئی غزل ان اوزان میں نظر سے نہیں گزری۔ آثر

جھلملاتا ہوا اک داغِ جگر — عہدِ رفتہ کی نشانی ہے وہی
اک تڑپ ہے کہ الٰہی توبہ — گو نہیں اشک، روانی ہے وہی
کوچۂ زخم ہے دل تا بہ جگر — شوق کی ریشہ دوانی ہے وہی
جل کے پروانے ہوئے خاکستر — شمع کی چرب زبانی ہے وہی
دل ہے ویرانِ تمنا برباد — آہ کی شعلہ فشانی ہے وہی
جس کو خمیازۂ حسرت کہئے — پھولوں کی تازہ جوانی ہے وہی
وصل ہو ہجر ہو جلوہ کہ حجاب — عشق کی تشنہ دہانی ہے وہی

بزم خالی ہے اثر سے لیکن
شورِ آشفتہ بیانی ہے وہی

ان انکھڑیوں کی مستی افسانہ کہہ رہی ہے — کس کس مزے سے رازِ میخانہ کہہ رہی ہے
تیرے نثار تو بھی اپنی زباں سے کہہ دے — اک خلق مجھکو تیرا دیوانہ کہہ رہی ہے
مستانہ گامزن ہوں یوں راہِ طلب میں — لغزش ہر آبلے کو پیمانہ کہہ رہی ہے
عاشق ہو خواہ شاعر دونوں کی چشمِ بینا — حاصل سے آرزو کو بیگانہ کہہ رہی ہے
پستی ہے اُن کی منزل جو پست حوصلہ ہیں — رفعت کو ہمت اپنا کاشانہ کہہ رہی ہے
کہہ دو یہ منعموں سے عشرتکدوں سے نکلیں — ان بستیوں کو عبرت ویرانہ کہہ رہی ہے
یارب وہ راز کیا ہے بعدِ طواف جس کو — شمعِ سحر سے خاکِ پروانہ کہہ رہی ہے
ہنگامِ بادہ نوشی رندوں کی تیرہ مستی — پیمانے کو بھی خطِ پیمانہ کہہ رہی ہے

چھترے کی سرزمیں کو میخانہ کہہ رہی ہے[1]
مینائے حافظی سے اُٹھ اُٹھ کے موجِ صہبا

محرم نہیں اثرؔ تم ورنہ خموشِ فطرت
کیا کیا نہ کہہ رہی تھی کیا کیا نہ کہہ رہی ہے

ابھی جیتے کچھ اور مر جانے والے
جھٹکتے نہ دامن اگر جانے والے

تجھے بھی مرے حال کی کچھ خبر ہے
مجھے مجھ سے بیگانہ کر جانے والے

پلٹ آئے سو بار جا جا کے گھر سے
ترے در سے اُٹھ اُٹھ کے گھر جانے والے

دُعاؤں کی تاثیر بھی لے گئے ہیں
گلے مل کے پچھلے پہر جانے والے

رسیلی نشیلی نگاہوں کا صدقہ
ادھر دیکھ لے اک نظر جانے والے

ہر اک ذرۂ خاک ہے درسِ عبرت
خبر شرط ہے بے خبر جانے والے

زمانے کی چالوں سے واقف نہیں ہیں
کدھر جا رہے ہیں کدھر جانے والے

کلیجا سنبھالے چلے آ رہے ہیں
تڑپتا مجھے چھوڑ کر جانے والے

لئے جا یہ اشکوں کے موتی لئے جا
اثرؔ سے چُرائے نظر جانے والے

نگاہِ شوق تو انہیں نہ یوں مچل مچل کے دیکھ
کہیں نہ دیکھ لے کوئی ارے سنبھل سنبھل کے دیکھ

---

(۱) حبیب محترم نواب محمد غلام محمد خاں حافظی عرف حاجی میاں (مرحوم)، رئیس دادوں۔ وطن چھوڑ کر اپنے پیر کے مزار مبارک کے بمقام خیرآباد ضلع سیتاپور مجاور ہو گئے تھے۔ ایسے خوش صفات انسان کم ہوتے ہیں۔ چھترا ضلع علی گڈھ میں اُن کا قائم کردہ مدرسہ ہے۔ وہیں ۳۹ء میں مشاعرہ ہوا تھا، اُسی کی غزل ہے۔ اثرؔ

یہ دل ہے اور یہ جگر، ترے نثار متصل نظر ملا ملا کے دیکھ، رُخ بدل بدل کے دیکھ

فراق کی یہ رات ہے قرار دل کو آچکا تڑپ تڑپ کے خواہ کروٹیں مل مل کے دیکھ

غرض پڑی ہے کیا انھیں نہ آئے ہیں نہ آئیں گے

ہزار بار گھر سے تو اثرؔ نکل نکل کے دیکھ

خموشی بھی نکوہش ہے تو پھر ضبطِ فغاں کیوں ہو مری جانب سے کوئی بے مروت بدگماں کیوں ہو

جو مجھ سے سرگراں ہو وہ کسی سے سرگراں کیوں ہو مرے حصے کا غم یارب نصیبِ دشمناں کیوں ہو

جسے ہو ربط سجدوں سے وہ کیوں میری جبیں ٹھہرے جسے پیدا کریں سجدے وہ تیرا آستاں کیوں ہو

خیال اُس جانِ جاں کا ہو تو ہر رفعت کو ٹھکرا دے نظر کی حد سہی پرواز کی حد آسماں کیوں ہو

خدا معلوم کتنے گلستاں میں نے بنا ڈالے خس و خاشاک کی تعمیر میرا آشیاں کیوں ہو

ابھی امید کا اک شائبہ ہے یاس میں ورنہ ہجومِ نامرادی کارواں در کارواں کیوں ہو

کسی کا ناز سے کہنا اور اُس کے بعد شرمانا بیاں، تو حُسن کا ہو پھر محبت کی زباں کیوں ہو

اثرؔ ہر حال میں جب ناگزیرِ عشق حرماں ہے

تو پھر اُس بے وفا سے مدعائے دل بیاں کیوں ہو

ہے وصل مگر پھر بھی وہی تشنہ لبی ہے اے عشقِ ستم پیشہ یہ کیا بوالعجبی ہے

دیکھے تو کوئی رنگ ستمگاریٔ قاتل بسمل سے دمِ ذبح سخن زیرِ لبی ہے

ہے شوقِ فراواں کا تقاضا کہ چلا چل سجدہ بھی رہِ عشق میں راحت طلبی ہے

مجبور ہوں میں گریۂ مستانہ سے زاہد ہر اشک میں کیفیتِ آبِ عنبی ہے

داغوں سے چراغاں ہے سیہ خانۂ دل میں — مہمان مرا ایک مہِ نیم شبی ہے
اے بندۂ اوہام کدھر دھیان ہے تیرا — اے مردِ خدا خود طلبی حق طلبی ہے
صد شکر کہ بیگانہ ہوا شورِ عطش سے — وہ دل کہ ودیعت کدۂ تشنہ لبی ہے

جب ناقص و نا اہل بنیں کامل و اکمل
نادان آخر عرضِ ہنر بولہبی ہے

محبت کس لیے آسودۂ غم ہوتی جاتی ہے — کہ دردِ دل میں اک لذت جو تھی کم ہوتی جاتی ہے
ہوس جتنی دلِ بیتاب سے کم ہوتی جاتی ہے — تری ہر آرزو روحِ مجسم ہوتی جاتی ہے
جہاں تک رازِ محرومی کی محرم ہوتی جاتی ہے — محبت اور بھی لب تشنۂ غم ہوتی جاتی ہے
کچھ اس انداز سے شبنم نے سوئے آسماں دیکھا — بساطِ لالہ و گل بزمِ ماتم ہوتی جاتی ہے
پریشانی میں دل کی جتنی ہوتی ہے فراوانی — کسی کی زلف برہم اور برہم ہوتی جاتی ہے
جہاں تک ناز برداری کرو اُس چشمِ پُرفن کی — دل آزاری میں کافر اور حاتم ہوتی جاتی ہے
عجب راحت ہے محنت میں بڑی لذت مصیبت میں — کہ ہمت رازِ خودداری کی محرم ہوتی جاتی ہے
پیاپے سامنا محرومیوں کا ہوتا رہتا ہے — بحمد اللہ پھر بھی سعیٔ پیہم ہوتی جاتی ہے
اُنھیں بھی آبدیدہ ہو کے اُٹھ جانا پڑا آخر — یہ کیا حالت تری اے جانِ پُرغم ہوتی جاتی ہے
ستم سے آزمائش کرنے والوں کو خدا رکھے — محبت اور محکم اور محکم ہوتی جاتی ہے
خدا معلوم ہستی کیا ہے، کیا ہے رازِ ہستی کا — جہاں تک شرح کرتے جاؤ مبہم ہوتی جاتی ہے
محبت کے عوض سودا ہے نفرت کی پرستش کا — نئی ترکیب سے ترتیبِ عالم ہوتی جاتی ہے

اثر اس دور میں تہذیب نے اچھی ترقی کی
بہائم کی سی شان ابن آدم ہوتی جاتی ہے

نہیں کہنے کی بات کیا کہئے — ان حسینوں کی گھات کیا کہئے
ستم ناروا چھپانے کو — نگہِ التفات کیا کہئے
بے وفا سے وفا کی ہے اُمید — اور وجبرِ حیات کیا کہئے
چاندنی میں رواں دواں بادل — زلف و عارض کی بات کیا کہئے
لبِ جاں بخش کے تصور میں — دم لبوں پر تھا رات کیا کہئے
چل گیا اُس نگاہ کا جادو — کہہ گئے دل کی بات کیا کہئے
لمحہ لمحہ دوام سے ہمدوش — عشق کی کائنات کیا کہئے
آئینہ اور عکس آئینہ — فرق ذات و صفات کیا کہئے

کچھ اثر آج سہمے سہمے ہیں
ہے عجب واردات کیا کہئے

وہ جلد جلد بدلتا ہوا زمانہ ہے — کہ آج ہے جو حقیقت وہ کل فسانہ ہے
شباب اور پھر اک خوش ادا حسیں کا شباب — بڑے غرور بڑے ناز کا زمانہ ہے
نہ پوچھ سادگیٔ شوق ٹالی جاتا ہوں — نہ جانتے ہوئے وعدہ فقط بہانہ ہے
اسیر مر گئے سُن کر یہ طعنۂ صیاد — اسی بہانے غریبوں کا آب و دانہ ہے
کبھی تھا چشم و چراغ ستارۂ سحری — "شکستگی" کا جو ہمنام آشیانہ ہے

یہی ہے ظرف بھلا کچھ تو شرم کر اے رند　　کہ تیرے جام میں اب تک مئی شبانہ ہے

جو کامیاب ہیں خوش ہوں نہ کامیابی پر　　ہر انقلاب میں ایک اور شاخسانہ ہے

کبھی ہے مہر و تلطف کبھی وفا کوشی　　خیال یار عجب دلبر یگانہ ہے

تری نگاہ نے چھیڑا تھا جن کو شوخی سے

دل اثرؔ انھیں نغمات کا خزانہ ہے

پھول میں جیسے رنگ بو نہ رہے　　حیف وہ دل کہ جس میں تو نہ رہے

عشق ہے اک نشاط بے پایاں　　شرط یہ ہے کہ آرزو نہ رہے

کیا یہ مطلب ہے اے غم جاناں　　تن میں اک بوند بھی لہو نہ رہے

آبیاری نہ ہو جو اشکوں سے　　گلشن عشق میں نمو نہ رہے

تیرے پردے نے کی ہے پردہ دری　　ورنہ یہ شور کو بکو نہ رہے

جیب کے حق میں حکم وحشت ہے　　کوئی گنجائش رفو نہ رہے

دل ہو یوں ہمکلام دل سے اثرؔ

کہ رہے اور گفتگو نہ رہے

صد شکر درد الفت اک درد بے دوا ہے　　جینے میں بھی مزا ہے مرنے میں بھی مزا ہے

اک نقش بن رہا ہے اک نقش مٹ رہا ہے　　پیش نظر ہے جو کچھ نیرنگ ماسوا ہے

سینچا ہوا لہو سے اک گلشن وفا ہے　　عشق غیور تیرا آئینۂ کربلا ہے

کیا حال دل سناؤں تو جانتا ہے سب کچھ　　کیا مدعا بتاؤں جب تو ہی مدعا ہے

جس کی رہ طلب میں سب کچھ لُٹا کے بیٹھے — افسوس اُس نے یہ بھی جانا نہیں کہ کیا ہے
شیب و شباب میں ہو بس اس قدر ہی نسبت — اک شوخ رنگ اُڑ کر دھبّا سا رہ گیا ہے
یہ بھیگی رات اور یہ برسات کی ہوائیں — جتنا بُھلا رہا ہوں وہ یاد آ رہا ہے

مقصودِ زندگی کا بیداریٔ خودی ہے — اے بے خبر وگرنہ بے سود زندگی ہے
عرفانِ بیخودی کی منزل وہ آ گئی ہے — محسوس ہو رہا ہے جیسے کوئی کمی ہے
فطرت ہے اک صحیفہ تفسیر آدمی ہے — تفسیر کا خلاصہ ذوقِ خود آگہی ہے
انسان روحِ اعظم انسان وجہِ عالم — اور تم سمجھ رہے ہو مورت وہ مٹی کی ہے
اک مستقل حقیقت، ناقابلِ تغیّر — ہستی جو یہ نہیں ہے ہستی ہی نیستی ہے
جب روح تن سے نکلی خوشبو ہی بن کے نکلی — کس درجہ کیف پرور پھولوں کی زندگی ہے
محرومیوں کے ہوتے سرشاریٔ تمنا — کچھ اُن کی شوخیاں ہیں کچھ اپنی سادگی ہے

شوریدہ طبع و رسوا بیگانۂ تلطّف
ہاں ہاں اثر یہی ہے او فتنہ گر یہی ہے

نقشِ پا یاسمن سے بہتر ہے — تو سراپا چمن سے بہتر ہے
حُسن تیرا ہے حُسن سے بالا — جس طرح روح تن سے بہتر ہے
سادگی میں جو بانکپن نکلے — سادگی بانکپن سے بہتر ہے
موجِ دریا کہ خاکِ صحرا ہو — عاریت کے کفن سے بہتر ہے

اپنی لذّت میں گم ہوئے نغمے
اب خموشی سخن سے بہتر ہے

ق

لکھنؤ اے دیارِ اہلِ کمال
خاک تیری چمن سے بہتر ہے

کتنے ہی ہیں جنھیں بقولِ اثرؔ
تیری غربت وطن سے بہتر ہے

تری حسرت میں ہر تارِ نظر شمع فروزاں ہے
چلا آ باز اب تک شوق میں آغوشِ مژگاں ہے

نگاہِ فتنہ زا پیہم خلش ریزِ رگِ جاں ہے
یہ تھوڑا اے دلِ برباد حسرت اُنکا احساں ہے

جنونِ شوق شغلِ خانہ ویرانی مبارک ہو
فقط دل ہی نہیں شیرازۂ ہستی پریشاں ہے

ہنوز آوارہ و رسوا ہے کوئے ناشکیبی میں
نہ سمجھا عشقِ شوریدہ کہ دل تیرا شبستاں ہے

ابھی جلووں کی حاجت ہے پئے تکمیلِ نظارہ
ابھی چشمِ تماشا سے جو پنہاں تھا وہ پنہاں ہے

خدا رکھے انھیں کب دھیان آیا ہے تلافی کا
کہ دل اور دل میں جو کچھ تھا وہ نذرِ یاس و حرماں ہے

کریمی دے گئی مژدہ یہ میری شرمساری کو
کہ عصیاں بہرِ رحمت اور رحمت بہرِ عصیاں ہے

اثرؔ وہ دل جو اک دن شکوہ سنجِ بے نیازی تھا
وہی دل خون ہو کر اپنی محرومی پہ نازاں ہے

تیرے دہن کی بات چمن میں جو چل گئی
کلیاں چٹک رہی تھیں صبا منہ مسل گئی

وہ ناز و دلبری نہ وہ سرگرمیٔ نیاز
دنیائے حُسن و عشق کی رت ہی بدل گئی

کانوں پہ ہاتھ رکھے قیامت کھڑی ہے دور
شوخی حیا کے سانچے میں بھرپور ڈھل گئی

سہمی ہوئی تھی صبح کی پہلی کرن کی طرح　　اُس کی طرف نگاہ جو پہلے پہل گئی

میں اُس سے کہہ چلا تھا محبت کا ماجرا　　وہ تو کہو کہ بات ادھوری ہی ٹل گئی

دل ڈوبتا ہے آہ بھی کرنا محال ہے　　کافر یہ کہہ رہا ہے طبیعت سنبھل گئی

کچھ شرم کچھ عتاب تو کچھ سوچ ہے اُنھیں　　کیا بات بیخودی میں زباں سے نکل گئی

کچھ اور بڑھ گئی ہیں پریشاں نگاہیاں　　دم بھر جو تیرے غم سے طبیعت بہل گئی

لڑتے ہو بات بات پہ ایک اک سے بے سبب
کچھ خیر ہے یہ کس سے اثر آج چل گئی

نگاہ ناز تیری فتنہ سامانی نہیں جاتی　　کبھی جو دل ٹھہرتا ہے تو حیرانی نہیں جاتی

نظر اُس حسن تاباں تک بآسانی نہیں جاتی　　مگر جا کر پلٹتی ہے تو پہچانی نہیں جاتی

ہوئی مدت کہ اُس نے ناز سے دامن کو جھٹکا تھا　　ابھی تک موجۂ گُل کی پریشانی نہیں جاتی

کہاں تک نام بدلے جائیں پھولوں میں ستاروں میں　　کرشموں کی ترے یوں بھی فراوانی نہیں جاتی

یہاں تک تو خراب لذت گفتار ساقی ہوں　　کہ خود مجھ سے بھی اپنی بات پہچانی نہیں جاتی

مری حسرت نہ پوچھو شمع سوزاں کی طرف دیکھو　　کہ ہے بے آشیاں لیکن پرافشانی نہیں جاتی

تعالی اللہ باوصف ہزاراں رندی و مستی　　خیال یار تیری پاک دامانی نہیں جاتی

جو بستر ہو تو اُس در پر جو تکیہ ہو تو اُس در کا
نہیں جاتی اثر لشکر تن آسانی نہیں جاتی

صبح بہار گُل نہ ہوائے چمن میں ہے　　وہ سرخوشی جو بادۂ حب وطن میں ہے

ہر نغمہ کیوں نہ قالب فریاد میں ڈھلے — دورِ خزاں ہمیشہ ہمارے چمن میں ہے
کیونکر ترانے گائیے عیش و نشاط کے — ہم بیکسوں پہ عالمِ غربت وطن میں ہے
شعلے بھڑک رہے ہیں فساد و عناد کے — اک آگ سی لگی ہوئی ہر سو چمن میں ہے
رہنے دے اے ہجوم غم و یاس و بیکسی — وہ دلکشی جو دور وطن سے وطن میں ہے

گل جھومتے ہیں جھومتے ہیں مست جس طرح
کس نَو بہار ناز کی آمد چمن میں ہے

کچھ دیر فکر عالمِ بالا کی چھوڑ دے — اس انجمن کا راز اسی انجمن میں ہے
آئینۂ جمال ہے وہ پیکرِ جمال — کیونکر کہوں کہ فرق کوئی جان و تن میں ہے
واحسرتا کہ وعدے کی تجدید بھی رہی — لکنت غضب کی اُس لبِ پیماں شکن میں ہے

خمخانۂ الست ہے گویا کھُلا ہوا
کیف ہزار بادہ اثر کے سخن میں ہے

۱۹۴۰ء

یاد ہے یاد ہے حجاب ترا ‌ ‌ ‌ ‌ اور بے وجہ پھر عتاب ترا
دل بھی خواہاں ہے جان بھی خواہاں ‌ ‌ ‌ ‌ سوچئے کس کو انتخاب ترا
کوئی لے لے بس اُنکا نام لے دل ‌ ‌ ‌ ‌ دیکھنا ہو جو اضطراب ترا
ایک خو کردۂ تلطف سے ‌ ‌ ‌ ‌ اللہ اللہ اجتناب ترا
دیکھ آنکھوں میں ڈال کر آنکھیں ‌ ‌ ‌ ‌ میری آنکھوں میں ہے جواب ترا
میں کہوں بھی تو کون سنتا ہے ‌ ‌ ‌ ‌ تیرا قصہ دل خراب ترا
جاگنا بھی ہے خواب کی صورت ‌ ‌ ‌ ‌ جب سے دیکھا ہے میں نے خواب ترا

بیکسانہ آثر کا ایک سوال
اور یہ دل شکن جواب ترا

شوق نے رسوا کیا اور خود بھی رسوا ہو گیا ‌ ‌ ‌ ‌ صبح کے تارے پہ اکثر اُن کا دھوکا ہو گیا
جب نگاہ مست ساقی کا اشارا ہو گیا ‌ ‌ ‌ ‌ موج مے بل کھا گئی سرشار مینا ہو گیا
خونِ دل خونِ جگر خونِ تمنا ہو گیا ‌ ‌ ‌ ‌ اک تغافل سے ترے بے درد کیا کیا ہو گیا

جانتا تھا اُس سے کہنا حالِ دلِ بے سود ہے ‎ ‎ ‎ تھا جنونِ شوق کا یہ بھی تقاضا ہو گیا

وہ بھی ہے تکرارِ وحدت کہتے ہیں کثرت جسے ‎ ‎ ‎ تیرا ہر جلوہ ترے مانندِ یکتا ہو گیا

اُس کا عالم؟ اُس کا عالم، ہم نے دیکھا ہو کبھی ‎ ‎ ‎ وہ ستارا جو "سحر افشاں" سراپا ہو گیا

آئنہ یا نقشِ پائے یار ہے، کھلتا نہیں ‎ ‎ ‎ اے جبینِ "سجدہ درآغوش" یہ کیا ہو گیا

کیوں نہ دنیائے خودی میں تنگ ہو اُسکا وجود ‎ ‎ ‎ قطرہ جو محوِ خروش و جوشِ دریا ہو گیا

شکوہ لذت کے لئے ہے ورنہ وہ کافر وہ ہے
دل دُکھانے سے اثر جو اور پیارا ہو گیا

لذت سے دونوں خالی جینا ہو خواہ مرنا ‎ ‎ ‎ بے عشق زندگی کا ممکن نہیں سنورنا

دل میں کسی کے گھر ہو یا دل ہو گھر کسی کا ‎ ‎ ‎ جینا ہے نام اسی کا باقی جو ہے وہ مرنا

میری نظر نے دیکھا آئینہ سحر میں ‎ ‎ ‎ اک نور کی کرن کا سو حسن سے سنورنا

وہ دورِ خامشی ہے رگ رگ میں سنسنی ہے ‎ ‎ ‎ شیشے کو توڑنا ہے اس وقت آہ کرنا

بندے خدا کے جھوٹا خوفِ خدا کہاں تک ‎ ‎ ‎ لازم ہے آدمی کو اپنے سے آپ ڈرنا

یہ طرفہ رسم نکلی تیرے ستم کشوں سے ‎ ‎ ‎ اُلفت ہزار کرنا اُلفت کا دم نہ بھرنا

آغوشِ زندگی میں گویا عروسِ نو ہے ‎ ‎ ‎ زینت حیات کی ہے مرنے کی طرح مرنا

صد عشرتِ نظارہ بے منتِ نظارہ ‎ ‎ ‎ اک نقشِ نازنیں کا تخیئل میں اُبھرنا

اُس بزم میں اثر کو رسوا کریگا اک دن
کھویا ہوا سا رہنا رُک رُک کے بات کرنا

کیا خبر اضطراب نے مارا   یا کسی کے حجاب نے مارا

مطلب دیر یاب نے مارا   ایک مبہم جواب نے مارا

دیکھ کر اس نگاہ کی مستی   جوشِ موجِ شراب نے مارا

اُن شکر خندہ لب نازک   غنچۂ پر گلاب نے مارا

جُرم اور جرم بھی محبت کا   لذت احتساب نے مارا

وہ پڑھی آنکھیں وہ جھکی پلکیں   یادِ ہنگامِ خواب نے مارا

دل کو تاکا جگر نشانہ تھا   شوخیٔ انتخاب نے مارا

کام نکلا نہ جب تغافل سے   ناز بن کر عتاب نے مارا

مجھ سے ہے اور نہیں سخن مجھ سے   تیرے طرزِ خطاب نے مارا

پوچھتا کیا ہے وجہ مرگِ اثر

تیرے کافر شباب نے مارا

عشوۂ کامیاب نے مارا   بے محل کے حجاب نے مارا

جلوۂ بے نقاب نے مارا   جو ہر آفتاب نے مارا

ہر قدم پر عذاب کی دھمکی   وضعِ اہلِ کتاب نے مارا

سُرخ ڈورے نہیں اُن آنکھوں میں   جال پر پیچ خواب نے مارا

دل غلط نام پڑ گیا جس کا   اس خدائی خراب نے مارا

زندگی نو بنو حقیقت تھی   وہم وحشتِ سراب نے مارا

نہ وہ در ہے نہ وہ جبینِ نیاز سجدۂ مستجاب نے مارا
توبہ کے بعد آج پی جو اثرؔ
تیر بوئے شراب نے مارا

کبھی گُلوں سے نشیمن جو چھپا کے دیکھ لیا
فلک سے برق نے گھونگھٹ ہٹا کے دیکھ لیا

حیا سے چار نہیں ہوتی آنکھ شوخی کی
یہ کس غریب کو ٹھوکر لگا کے دیکھ لیا

کیا ہے اُس نگہِ مست نے گلہ کیا کیا
کبھی جو درد کا پہلو بچا کے دیکھ لیا

نہ تیری نکہت خوش ہے نہ تیری رعنائی
ضمیرِ گل میں بھی میں نے سما کے دیکھ لیا

دلِ خراب کی حسرت پرستیاں نہ گئیں
ہر ایک نقش و نما بھی مٹا کے دیکھ لیا

مذاقِ دید اُسی کا ہے رشک کے قابل
کہ جس نے تجھ سے بھی تجھ کو چھپا کے دیکھ لیا

کُھلا نہ رازِ حقیقت تو شوقِ رُسوا نے
حقیقتوں کو فسانہ بنا کے دیکھ لیا

تجھے قسم ہے بھرے جا اُسی کا دم اے دل
ہزار بار جسے آزما کے دیکھ لیا

لبِ خموش کی حسرت نوائیاں ہے ہے
اثرؔ کو بزم سے اپنی اُٹھا کے دیکھ لیا

مسلسل

نشۂ شوق ہے بے رنجِ خمار آج کی رات
میں ہوں خود اپنی محبت سے دوچار آج کی رات

ہر نفس مژدہ و ہر جنبشِ مژگاں پیغام
کچھ تمناؤں کی حد ہے نہ شمار آج کی رات

شورش دل میں ہے انداز شکیبائی کا
لذت درد ہے محکوم نثار آج کی رات

گل کے مانند شگفتہ جسے کرتی ہے نسیم
میری آغوش ہے آغوش بہار آج کی رات

بیخودی بھرتی ہے مینائے تصور میں شراب
عشق شوریدہ ہے یوں بر سر کار آج کی رات

مے و مینا ہے نہ ساقی ہے نہ پیمانہ ہے
رنگ اُڑنے پہ ہے مستی کا ابھار آج کی رات

شوق کہتا ہے کہ خود اپنی بلائیں لے لے
عشق میں حُسن کا پیدا ہے نکھار آج کی رات

خود محبت پہ محبت کی نظر پڑتی ہے
خود تمنا ہے تمنا پہ نثار آج کی رات

مستیٔ شوق میں اتنا بھی نہیں ہوش اثرؔ
دل ہے پہلو میں کہ وہ جان بہار آج کی رات

اعادہ وعدے کا بے مہر بار بار نہ کر
جو بے قرار ہے اور اُس کو بے قرار نہ کر

مجھے بہت ہے تبسّم کی فتنہ سامانی
خراب طرّۂ گیسوئے تابدار نہ کر

جنوں فزا ہے تصور بھی ایسے عالم کا
نگاہ مست کو آلودۂ خمار نہ کر

چھپائے لیتا ہے منھ کو شفق کے دامن میں
اب اور صبح کے تارے کو شرمسار نہ کر

سرشک یاس کا دامن لہو سے پاک ہے
خزاں کے رنگ میں آمیزش بہار نہ کر

تمام نغمہ رنگیں ہے عشق کی دنیا
مگر یہ شرط ہے نے کوئی اختیار نہ کر

بہار آئینہ دار خزاں نہ ہو جائے
گُلوں کے رنگ سے اندازۂ بہار نہ کر

تجھے ہے عشق کی معصوم آرزو کی قسم
گناہگار نہ کہہ کر گناہگار نہ کر

بھڑک نہ اُٹھے دبی ہے جو آگ دل میں اثرؔ
بغیر اشک پیے آہ بار بار نہ کر

حاصلِ عشقِ حُسن ہے رنگِ فتادگی نہ دیکھ
شوق کی تشنگی نہ دیکھ حال کی برہمی نہ دیکھ

پرتوِ آفتاب سے ذرہ بھی آفتاب ہے
ایک میں روشنی کے بعد ایک میں تیرگی نہ دیکھ

تو ہے امینِ راز کا تیرا مقام اور ہے
سوئے جہانِ رفتنی آنکھ اُٹھا کے بھی نہ دیکھ

ایک جہان سرخوشی تیری نظر سے ہے نہاں
کیف تمام بن کے دیکھ ورنہ سوئے خودی نہ دیکھ

جوش و خروشِ بحر میں نغمۂ سرمدی بھی ہے
موج سے ہمکنار ہو راہ سفینے کی نہ دیکھ

مثلِ نسیم رقص کر رقص کر اور وجد کر
توڑ طلسمِ کیف و کم چرخ کی کجروی نہ دیکھ

اُن کے غرورِ حُسن کو یہ بھی ہے ناگوار اثر
اُن کی ادائے ناز میں کتنی ہے دلکشی نہ دیکھ

چاہا حریفِ جلوہ تو ہونا بہار نے
مہلت نہ دی تبسمِ نیم آشکار نے

سرشاریوں کی حد ہے کوئی اے نگاہِ شوق
پیدا کیا ہے نشّے کا عالم خمار نے

آلودۂ سرشک ہے وہ چشمِ سُرمہ سا
یہ کیا ستم کیا دلِ حسرت شعار نے

تیرے خرامِ ناز کی اللہ ری دلکشی
پامال ہو کے رقص کیا ہے بہار نے

جھپکی نہیں پلک کہ قیامت گزر گئی
فرصت کبھی جو دی خلشِ انتظار نے

اک ٹھنڈی سانس بھر کے انھیں یاد کر لیا
سب کچھ بھلا کے عشقِ فراموش کار نے

غنچہ ہو جیسے مائیوں بیٹھے کوئی دلھن
مشاطگی کی حد نہیں رکھی بہار نے

اسرار سے حیات کے بیگانہ کر دیا
موہوم کہہ کے دیدۂ بے اعتبار نے

دیکھے تو کوئی وعدۂ فردا کی دلکشی
طے کی نہ حد شوق کبھی انتظار نے

ایک اشک خوں مژہ سے اثر یوں ٹپک پڑا
ٹپکا ہو جیسے جام کسی بادہ خوار نے

وہ دل ہی کیا جو دید کا ساماں نہ کر سکے
نظارے کو تمام گلستاں نہ کر سکے

اے عشق آج یوں ہو نوا سنج اضطراب
آلودہ وہ بھی خواب سے مژگاں نہ کر سکے

سارے گلوں کا ایک تبسم جواب تھا
القصہ بے وفا کو پشیماں نہ کر سکے

اتنا بھی ابکی ہوش نہیں تھا بہار میں
چھینا گیا سپردِ گریباں نہ کر سکے

ہر بار نکھری ایک نئے حسن سے وہ زلف
ترتیب خوابہائے پریشاں نہ کر سکے

بحر بلا کی موج کو ٹکرا دے موج سے
ہمت جو دورِ گردیٔ طوفاں نہ کر سکے

ایماں غلط اصول غلط ادعا غلط
انساں کی دلدہی اگر انساں نہ کر سکے

سرگشتہ کب سے فہم و ذکا عقل و ہوش ہیں
اک ذرے کے بھی راز کا عرفاں نہ کر سکے

ہمدوش جو دوام سے کر دے حیات کو
وہ پہلوئے حیات نمایاں نہ کر سکے

دیکھیں نیاز عشق کی مجبوریاں اثر
درماں کو درد درد کو درماں نہ کر سکے

تہہ میں ہر ایک راز کے اک یہ بھی راز ہے
پردہ نہ ہو تو ساز نہ آہنگ ساز ہے

کافر ہوں لطف و جور جو یکساں نہ ہوں مجھے
جو بھی تری ادا ہے وہ عاشق نواز ہے

جو عشق ہے وہ حسن ہی جو حسن ہے وہ عشق
بیگانگی کی وجہ ترا امتیاز ہے

تیری نگاہ ناز کے قربان جائیے
دل کی جگہ اب اک خلش جاں نواز ہے

یہ تو نہیں کہ رونے کی حسرت نہیں رہی — اشکوں کو اب مژہ سے مری احتراز ہے
وہ دن گئے کہ شوق تھا مرہون التفات — عرض نیاز اب پئے تجدید ناز ہے
ہمت ہی استوار تو رہرو کو خوف کیا — منزل کا جزو ہے جو بھی نشیب فراز ہے

کعبے کا احترام مسلم مگر اثر
اس سے بلند معبد اہل نیاز ہے

عرض نیاز سلسلۂ جنبان ناز ہے — اے عشق مژدہ عمر تمنا دراز ہے
زاہد ضمیر اپنا جو ہو دیکھنا تو آ — آئینے کی طرح در میخانہ باز ہے
پھر میں ہوں اور مطلب مشکل کی جستجو — پھر میں ہوں اور جلوۂ بیگانہ ساز ہے
اے ہجر یار تیری سیاست کو کیا ہوا — خاموشیاں ہیں اور لب شیون طراز ہے
نامحرموں نے لاکھ مرتب کئے نظام — جو بزم راز تھی وہ ابھی بزم راز ہے

کیا زمانہ تھا کہ جب تم مجکو مضطر دیکھتے — زیر لب کچھ کہتے چپ رہتے مکرر دیکھتے
آرزو ہے پھر ہنسی اس لعل لب پر دیکھتے — رنگ میں ڈوبی ہوئی اک موج گوہر دیکھتے
ہوش میں کیا آئے وہ دیوانہ تم جس سے کہو — اب تو دل کڑھتا ہے تجکو خاک بر سر دیکھتے
اُن کے آنے کی بندھی تھی آس جب تک ہم نشیں — صبح ہو جاتی تھی اکثر جانب در دیکھتے
اُف وہ اُن کی شوخیاں اور شوق کی رسوائیاں — دیکھتے تھے وہ ہمیں ہم اُن کو کیونکر دیکھتے
تم کو رحم آتا ضرور آتا اگر پرسش کے بعد — شوق کی بیدست و پائی بھی ٹھہر کر دیکھتے

اب دلِ مشتاق کو اُن سے یہ شکوہ ہے آثرؔ
جب ادھر دیکھا ہی تھا تو آنکھ بھر کر دیکھتے

دم اُلٹتا ہے کبھی جی پہ بنی ہوتی ہے
جب تری شام غریب الوطنی ہوتی ہے

پیشہ فرہاد کا تھا عشق ہے بدنام عبث
دردمندوں سے کہیں کوہکنی ہوتی ہے

چُپ بھی رہتے ہو تو گفتار کا ہوتا ہے گماں
شاذ اس طرز کی شیریں سخنی ہوتی ہے

خدمتِ خلق کو ہے فطرتِ عالی درکار
چھاؤں چھتنار درختوں کی گھنی ہوتی ہے

یوں دھڑکتا ہے دلِ زار آثرؔ راتوں کو
دور پر جیسے کہیں سینہ زنی ہوتی ہے

کچھ آنکھوں ہی آنکھوں میں کہہ جانے کو کیا کہئے
تسکین کے پردے میں تڑپانے کو کیا کہئے

اُمید تسلّی سے گھبرانے کو کیا کہئے
اب اس دلِ وحشی کے سمجھانے کو کیا کہئے

گردش تھی ابھی مبہم ساقی کی نگاہوں کی
پھر بھی جو چھلک جائے پیمانے کو کیا کہئے

مانا کہ حیا آئی مشتاق نگاہوں سے
خود اپنی اداؤں سے شرمانے کو کیا کہئے

جس دل کی تمنائیں سرمایۂ ہستی تھیں
اُس دل کی تمنا میں مٹ جانے کو کیا کہئے

مشکل سے جو اُٹھی تھیں پلکوں کے سہارے سے
ملتے ہی اُن آنکھوں کے جھک جانے کو کیا کہئے

جب دل کے دھڑکنے میں آغوش کی تنگی تھی
آغازِ محبت کے افسانے کو کیا کہئے

جس وقت نسیم آئے پیغامِ سحر لے کر
گلبرگ پہ شبنم کے تھرانے کو کیا کہئے

جب چاندنی چھٹکی ہو اور پھول مہکتے ہوں
جاگی ہوئی آنکھوں کے بھر آنے کو کیا کہئے

اک شعلۂ مضطرب سے بن بن کے تپش پیٹا — دیوانہ نہ کہئے تو پروانے کو کیا کہئے
مستقبل تازہ ہے جو خاک کا ذرّہ ہے — جب زیست مسلسل ہو مرجانے کو کیا کہئے

نالوں نے اثرؔ کے پھر ہنگامہ کیا برپا
منہ پھیر کے پھر کہہ دو "دیوانے کو کیا کہئے"

تصور میں اُن کے سحر ہو رہی ہے — پری نور سا گر منہ دھو رہی ہے
ایں نازنینی و ناز آفرینی — ستم ہے کہ مشق ستم ہو رہی ہے
محبت سمجھ کر مآل محبت — کبھی ہنس رہی ہو کبھی رو رہی ہے
حقیقت کہ اوہام میں گھر گئی تھی — بحمد اللہ آزاد پھر ہو رہی ہے
نہ جانے ستمگر نے کس طرح دیکھا — رگ جاں میں اب تک تپک ہو رہی ہے
دم خواب ہو دست نازک جبیں پر — کرن چاند کی گود میں سو رہی ہے

اثرؔ کا سلام ایسے مذہب کو جس میں
پرستش فقط نفس کی ہو رہی ہے

یوں دل ہے شوق شرح تمنا لئے ہوئے — جیسے ہو مست جام چھلکتا لئے ہوئے
اُمید سج رہی ہے پھر ایوان آرزو — گلدستہائے داغ تمنا لئے ہوئے
پھر دل ہے اور شورش طوفاں آرزو — طرز نشاط جوشئ مینا لئے ہوئے
یہ انتظار ہے کہ ہے آغوش انتظار — اک پیکر جمال سراپا لئے ہوئے
بے ہے وہ اضطراب کہ پابند ضبط ہو — تہہ میں ہزار نالۂ رسوا لئے ہوئے

ہر ذرۂ غبار میں ہیں چشمکیں مگر
انداز پردہ داریٔ لیلیٰ لیے ہوئے

اے وائے چشم شوق کہ محروم دید ہے
سامان صد ہزار تماشا لیے ہوئے

وعدہ خلاف دیکھ محبت کی سادگی
پھر دل ہے شوق وعدۂ فردا لیے ہوئے

وہ بھول سی نگاہ وہ ہلکی سی دل پہ چوٹ
اور اب وہی ہے درد کی دنیا لیے ہوئے

جس کا ہر ایک قطرہ ہو طوفاں بدوش اثرؔ
مینائے آرزو ہے وہ صہبا لیے ہوئے

آغاز محبت کی لذت انجام میں پانا مشکل ہے
جب دل کو سو سے سہتے تھے اب ہاتھ لگانا مشکل ہے

متوالی رسیلی آنکھوں میں نیند ایسی گھُتی ہے کہ بس توبہ
فتنے تو اُٹھانا اک جانب جادو بھی جگانا مشکل ہے

طائر ہو نہ صید وحشی ہو دل ہے البتہ تڑپتا دل
دیکھو تو ادھر کوشش تو کرو کیا ایسا اُٹھانا مشکل ہے

کچھ مشق ندامت ہوتی ہے کچھ عذر ستم بھی کرتے ہو
جانوں کے کھپانے والوں کو ہنس ہنس کے رُلانا مشکل ہے

جو عشق کے فن کے ماہر ہیں اُن سے پوچھو تم کیا جانو
کب اشک بہانا مشکل ہو اور کب پی جانا مشکل ہے

موسم اور وقت کی باتیں ہیں آتیں ہیں گئیں وہ برساتیں ہیں
رونے میں کبھی طوفاں تھے اب دو اشک بہانا مشکل ہے

آفت میں بلا میں گھرتے رہو سرگشتہ و حیراں پھرتے رہو
یہ عشق کا وادی ہے اس میں آرام تو پانا مشکل ہے

کہنے اور طول سے کہنے کی حسرت تھی لیکن جب پوچھا
منھ اُس کا تکتے رہ گئے یعنی حال سُنانا مشکل ہے

میں میرؔ کا دم بھرتا ہوں اثرؔ میں اُس کے کلام کا شیدا ہوں
ہاں شعر تو تم کہہ لیتے ہو، وہ بول بنانا مشکل ہے

غم نہیں عشرت جاوید کا پیغام ابھی
دم نہ لے دور ہے الفت کا سر انجام ابھی

ذرے ذرے نے سنا وجد کیا رقص کیا
تجکو ہے شکوۂ محرومیٔ پیغام ابھی

آشنا خاک ہو منزل سے ترا ذوقِ طلب — خود تری جہد نہیں جہد کا انعام ابھی
صورتِ شاہدِ مقصود نظر کیا آئے — ذوقِ دیدار میں حائل ہیں در و بام ابھی
صبحِ عشرت سے ہم آغوش ہو کیا شامِ الم — تو نے توڑا نہیں پیمانۂ ایام ابھی
تم نے انسان کی فطرت پہ کبھی غور کیا — مئے سرجوش ابھی دُردِ تہِ جام ابھی
دیکھنا ہے تو انھیں فکر میں شاعر کی دیکھ — سینۂ سنگ میں سوتے ہیں جو اصنام ابھی
تیری تنویر سے آراستہ ہے میری سحر — تیری خوشبو سے مہکتی ہے مری شام ابھی

کہہ کے یہ چھین لیا مجھ سے مجھے اُس نے اثرؔ
کہ فراموش نہیں اپنا تجھے نام ابھی

جوش کھا اور کہ سودا ہے ترا خام ابھی — شورشِ دل نہیں بے منتِ پیغام ابھی
منزلِ ہوش سے مستانہ گزرنا معلوم — نکہتِ گُل کی طرح ہو تو سُبک گام ابھی
کہیں مانوس نہ حرماں سے طبیعت ہو جائے — رہنے دے کچھ خلشِ حسرتِ انجام ابھی
جو تبسم نے ترے جاتے ہوئے بخشا تھا — دل میں رقصاں ہے وہی شعلۂ گلفام ابھی
جان بھی نذر کروں گا دلِ بیتاب ٹھہر — لوٹ لینے دے ذرا لذتِ پیغام ابھی
دل میں وہ شور ہے برپا کہ الٰہی توبہ — تم نے چپکے سے لیا کیا تھا مرا نام ابھی
ہم ہیں وہ رند کہ مستی میں اگر ہُو کر دیں — ایک مرکز پہ کھنچ آئیں سحر و شام ابھی
دل سلامت رہے اکثر یہ گماں ہوتا ہے — میرے پہلو میں ہے اک شاہدِ خودکام ابھی
جو کہا تھا تری آنکھوں نے دھڑکتے دل سے — گونجتا ہے مرے کانوں میں وہ پیغام ابھی

ایک صورت کہ ہو بدلی میں ستارا جیسے — میرے اشکوں میں جھلکتی ہے سرِ شام ابھی

کہہ کے یہ کھینچ لیا ہاتھ اثرؔ ساقی نے
تیرے دل سے نہیں نکلی ہوسِ جام ابھی

محبت کا ہو گا اثر ہوتے ہوتے — ادھر ہو گی اُن کی نظر ہوتے ہوتے
دلِ مضطرب کا جو عالم یہی ہے — نہ ہوں گے ہم اُن کو خبر ہوتے ہوتے
بالآخر اُسی کی سی کہنے لگا دل — ادھر ہوتے ہوتے اُدھر ہوتے ہوتے
اُنھیں دیکھتا تھا کبھی آنکھ بھر کر — وہ خوش کب تھے ناراض اگر ہوتے ہوتے
ترا کام جو ہے کیے جا کیے جا — اثر ہو گا اے چشمِ تر ہوتے ہوتے
ستارو گواہی تمھیں دینا ہو گی — نظر تھی سوئے در سحر ہوتے ہوتے
محبت کے مارے ہوؤں کا فسانہ — قیامت ہوا مختصر ہوتے ہوتے
ادھوری سُنی اُس نے میری کہانی — فسوں رہ گیا کارگر ہوتے ہوتے
پلک پر جو پچھلے پہر تھا وہ آنسو — ستارا سا چمکا سحر ہوتے ہوتے

حجاباتِ دوری اُٹھاتا چلا جا
اثرؔ ہو گا دل ان کا گھر ہوتے ہوتے

شاد تو کیا برباد کرو گے — لو دل لو کیا یاد کرو گے
حسرتِ بیداد اُس کو رہے گی — تم جس پر بیداد کرو گے
تم نے کہا اور میں نے مانا — پاسِ دلِ ناشاد کرو گے

بے دردو یہ کس کو خبر تھی — دل سا نگر برباد کروگے
اُس کی جفا پر صبر کہاں تک — اُکتا کر فریاد کروگے
دیکھو تو دم بھی اسیروں میں ہے — تم کس کو آزاد کروگے

جذب اگر ہے عشق اثر میں
ایک نہ اک دن یاد کروگے

۱۹۴۱ء

دل کہ ہلاک شوق تھا اب ہے حُسن کی دنیا کیا کہنا
جوش طرب ہے ترک طلب میں ترک طلب کا کیا کہنا

آئینہ دار عشرت دریا قطرہ بھی مثل دریا ہے
کیسی جدائی وصل کہاں کا ایک ہے نقشا کیا کہنا

ساز فنا پر گیت بقا کا دل کا مغنّی چھیڑ چکا
رنگ میں ڈوبی ڈوب کے ابھری موج طرب کیا کہنا

عشق کی باتیں عشق ہی جانے دید کا جب ہنگام ہوا
شوق کو پردا آپ بنایا اُس پہ تقاضا کیا کہنا

داغ ہوا دل خون ہوا پھر اشک بنا پھر ٹپکا پھر
رنگ بنا پھر اُڑنے لگا پھر ۔ جوش تمنا کیا کہنا

بزم بھی آخر دور بھی آخر شمع بجھی سی جلتی ہے
تم کو بھی جلدی ہم بھی مسافر ورنہ ابھی تھا کیا کہنا

حیف اثر کا چُپ چُپ رہنا اور کبھی جو بات بھی کی
طنز سے تیرا ہنس کر کہنا "آپ کی سُننا کیا کہنا"

دیکھ لے تجھکو اتنی تاب کہاں — چشمِ خیرہ ہے آفتاب کہاں
کان سُنتے ہیں دور کی آواز — اب وہ ہنگامۂ شباب کہاں
زندہ باد اے غرورِ محرومی — تو کہاں نشۂ شراب کہاں
دل سے اُٹھتا ہے کچھ دھواں سا کبھی — اب وہ پہلا سا اضطراب کہاں
تیری پرسش پہ ضبط آہ کریں — دردمند دل کو اتنی تاب کہاں
شاخِ گُل ہو کہ موجِ بادہ ہو — تیری انگڑائی کا جواب کہاں
سرگرانی کہ بدگمانی ہے — اب تبسم پسِ عتاب کہاں
عام تیری تجلیاں ہیں مگر — بزم کی بزم کامیاب کہاں

وہ جو ہے میر کی غزل میں اثر
سلکِ گوہر میں آب و تاب کہاں

بیکس کی طرف غصے کی نظر انسان کا دل تھا ٹوٹ گیا
جس ہاتھ میں دامن تھا کانپا اور ہاتھ سے دامن چھوٹ گیا
روداد محبت کیا کہئے اک درد بھرا افسانہ ہے
پہلو میں نہ تھا دل چھالا تھا اُبھرا، ٹپکا اور پھوٹ گیا

اُلفت کی نرالی رسمیں ہیں دل ایک نظر میں اُن کا تھا
شکووں کے عوض تھا شکرِ جفا کس وقت میں بھیدی ٹوٹ گیا

دریا ہوں مگر ایسا دریا جو بحر کے نزدیک آپہنچا
وہ جوش و روانی ختم ہوئی ہر شغل و علاقہ چھوٹ گیا

حجابِ رنگ و بو ہے اور میں ہوں — یہ دھوکا تھا کہ تو ہے اور میں ہوں
مقامِ بے نیازی آگیا ہے — وہ جانِ آرزو ہے اور میں ہوں
فریبِ شوق سے اکثر یہ سمجھا — کہ وہ بیگانہ خو ہے اور میں ہوں
کبھی سودا تھا تیری جستجو کا — اب اپنی جستجو ہے اور میں ہوں
کبھی دیکھا تھا اک خوابِ محبت — اب اُس کی آرزو ہے اور میں ہوں
فقط اک تم نہیں تو کچھ نہیں ہے — چمن ہے آبجو ہے اور میں ہوں
پھر اس کے بعد ہے اک ہو کا عالم — بس اک حد تک ہی تو ہے اور میں ہوں

ق

پھر آئی بوئے مستانہ کسی کی — وہی پھر ہاؤ ہو ہے اور میں ہوں
مشامِ جاں معطّر ہو رہا ہے — نسیم مشکبو ہے اور میں ہوں

اثر گلہائے نغمہ کھل رہے ہیں
کسی کی گفتگو ہے اور میں ہوں

ساحل سے بے نیاز ہوا جا رہا ہوں میں
موجوں کا اضطراب بنا جا رہا ہوں میں

ایسی پلا دی اُس نگہِ میفروش نے
رنگینیوں میں غرق ہوا جا رہا ہوں میں

آئینہ بن گیا ہوں کسی کے جمال کا
اپنی نظر میں آپ کُھپا جا رہا ہوں میں

میری تباہیوں میں ہے گویا کسر ابھی
پامالِ التفات کیا جا رہا ہوں میں

وہ دن گئے کہ دل تھا ہوس کشتۂ نشاط
ٹھکرا کے بزمِ عیش اُٹھا جا رہا ہوں میں

شوریدگیِ عشق مبادا ہو پردہ در
آغوشِ بیخودی میں دیا جا رہا ہوں میں

پروانہ اور نصیب نہ ہو شمع کا طواف
جلتا نہیں ہوں اور جلا جا رہا ہوں میں

دل والو اس کے بعد ہے تدبیرِ ضبط کیا
پابندِ اضطراب کیا جا رہا ہوں میں

مغرور اس قدر نہ ہو حُسنِ جفا پسند
اپنی وفا پہ آپ مٹا جا رہا ہوں میں

اے عشق تیری خیر کدھر لے چلا مجھے
اپنی نظر سے آپ چُھپا جا رہا ہوں میں

ہر سمت سے ہے بارشِ انوارِ سرمدی
جلووں میں شور بور ہوا جا رہا ہوں میں

کعبے کا احترام مسلّم مگر اثرؔ
دل سوئے دیر لے کے چلا جا رہا ہوں میں

دل گیا بے قراریاں نہ گئیں
عشق کی خامکاریاں نہ گئیں

مر مٹے نام پر وفا کے ہم
تیری بے اعتباریاں نہ گئیں

لب پہ آیا نہ اُس کا نام کبھی
غم کی پرہیزگاریاں نہ گئیں

کھپ گئی جان بجھ گئے تیور
اشک کی تابداریاں نہ گئیں

توبہ کرنے کو ہم نے کی تو مگر — توبہ کی شرمساریاں نہ گئیں
جان آ آ گئی لبوں پہ مگر — شوق کی پردہ داریاں نہ گئیں
وہ ہیں کینہ ہے سرد مہری ہے — اپنی جانب سے یاریاں نہ گئیں

گریہ بھی ہے اثر کا مستانہ
نہ گئیں بادہ خواریاں نہ گئیں

ذوقِ الم ہے اہلِ فریاد ان دنوں — یہ حال کیا ہے اے دلِ ناشاد ان دنوں
کیا میں ترے ستم کے بھی قابل نہیں رہا — پھرتی ہے دل سے دور تری یاد ان دنوں
اے پاسبان درد ذرا دل سے ہوشیار — تیغا کیا تو ہے در فریاد ان دنوں
ایسا بہار لالہ و گل نے فسوں کیا — اپنا اسیر آپ ہے صیاد ان دنوں
اُس کا گلہ اُسی سے کیا غیر کی طرح — یہ اپنی بیکسی کی ہے روداد ان دنوں
تیرے نثار کوئی نیا جور وضع کر — ترکِ ستم ہے کیوں ستم ایجاد ان دنوں
اتنا تو دل ہی شکووں سے تیرے بھرا ہوا — رک رک کے لب پہ آتی ہے فریاد ان دنوں

ناشاد نامراد غریب الدیار دل
آتا ہے بار بار اثر یاد ان دنوں

وہ اک نگاہِ محبت شراب آلودہ — اور اُس پہ خندۂ نوشیں حجاب آلودہ
خدا ہی ہے جو محبت کی لاج رہ جائے — کہ انتظار ہوا اضطراب آلودہ
ہوس نشاط نہیں ترکِ خامکاری کر — بہت ہوا دل خانہ خراب آلودہ

یہ کس کی بزم میں تھا اذن باریابی آج — نسیم کا ہے گریباں گلاب آلودہ
یہ کون رند پشیماں ہوا ہے توبہ سے — دعائے نیم شبی ہے شراب آلودہ
نظر فروز ہے منظر جو تاب دیدہ ہے — وہ چشم مست ہو جس وقت خواب آلودہ

اثرؔ نثار تمنائیں پوچھنے والے
بہت ہے ایک نگاہ عتاب آلودہ

دل ماسوائے دوست سے بیگانہ چاہیئے — سرگرم کار صورت پروانہ چاہیئے
غرق نشاط صورت پیمانہ چاہیئے — ہستی تمام لغزش مستانہ چاہیئے
منزل وہ ڈھونڈ جو نہ ہو جادے سے آشنا — مشکل پسند ہمت مردانہ چاہیئے
اک ٹھنڈی سانس اک نگہ یاس پھر سکوت — ان سرخیوں کی شرح کو افسانہ چاہیئے
تیرے نثار دیکھ ادھر بار بار دیکھ — تسکین دل کو آج پری خانہ چاہیئے
ایسا نہ ہو کہ حُسن بھی ہو شورش آشنا — اتنا لحاظ اسے دلِ دیوانہ چاہیئے
ہاں حاصل حیات ہے ذوق خود آگہی — لیکن فریب ہوش سے بیگانہ چاہیئے
ہر لمحہ زندگی کا ابد سے ہو ہمکنار — جو یوں نہ جی سکے اُسے جینا نہ چاہیئے
مجبوریوں پہ محشر صد آرزو ہے دل — کچھ اختیار اگر ہو تو کیا کیا نہ چاہیئے

دنیا تمام بزم خرابات ہو اثرؔ
طرز نوی سے گردش پیمانہ چاہیئے

ہر نقشِ آرزو کو مٹاتے چلے گئے — دیوانے اپنا رنگ جماتے چلے گئے

ہم جس قدر بھی جان کھپاتے چلے گئے
بے درد اور دل کو دُکھاتے چلے گئے

صہبائے رنگ و نور کہ اُن کی نگاہ تھی
مستوں کو اور مست بناتے چلے گئے

ہر منظرِ حیات میں بھر کر سرور و کیف
ہر منظرِ نشاط پہ چھاتے چلے گئے

ظاہر کا وہ عتاب وہ در پردہ التفات
تڑپاتے اضطراب بڑھاتے چلے گئے

اُف قہرمانِ عشق کہ امکان تھا، مگر
مطلب کی بات اُن سے چھپاتے چلے گئے

آنکھوں کو کیا کروں ابھی ترسی ہوئی سی ہیں
جلوے ہزار دل میں سماتے چلے گئے

دلداریاں نئی ہیں دل آزاریاں نئی
برباد کرتے پھر جتاتے چلے گئے

اپنے وہ رہنما ہیں کہ منزل تو اک طرف
کانٹے رہِ طلب میں بچھاتے چلے گئے

خمخانۂ حیات سے رندانِ بادہ مست
پیتے پلاتے دھوم مچاتے چلے گئے

آج اُن کا سامنا جو ہوا، کیا کہوں اثرؔ
شکوے زباں پہ آئے تو آتے چلے گئے!

وہی منزل سے واقف ہے وہی آدابِ منزل سے
تری راہِ طلب میں ہاتھ اُٹھا بیٹھے جو حاصل سے

"قدم لغزیدہ لغزیدہ نگہ دزدیدہ دزدیدہ"
وہ آئے اس طرح دل میں وہ پلٹے اس طرح دل سے

مثالِ سیل روکے سے کسی کے پھر نہیں رُکتا
رہِ حق میں فقط پہلا قدم اُٹھتا ہے مشکل سے

مری مشکل پسندی پر مری ناکامیاں صدقے
وہی راہیں چلا بیگانگی تھی جن کو منزل سے

معاذ اللہ لذت اُس خلش کی جب محبت میں
حریفِ معنیٔ رنگیں زباں ہوتی ہے مشکل سے

نظر مستانہ اُٹھی تھی لبوں پر کچھ تبسم تھا
اب اس کے بعد کس کو ہوش وہ کیا کہہ گئے دل سے

کسی کی یاد کیا آئی کہ موجِ بے قرار آئی — سفینہ شوق کا جو لے اُڑی آغوشِ ساحل سے
بفیضِ بے خودی گم گشتگی کا وہ مقام آیا — کہ اپنی ہی صدائے بازگشت آتی ہے منزل سے
بہت آساں ہے دیکھی ہوئی شے کا بیاں کرنا — مگر جذبات کی صورتگری آتی ہے مشکل سے

چمن چمن لئے پھرتی ہے بوئے یار مجھے — نسیم سمجھی ہے سرگشتۂ بہار مجھے
کنارِ شوق میں چپکے سے اب چلا بھی آ — کہ مجھ سے چھین چکا تیرا انتظار مجھے
خیال چھوڑ دے اب جور کی تلافی کا — کہ اس طرح تو کرم بھی ہے ناگوار مجھے
کبھی تمام تلطُّف کبھی تمام عتاب — فریب دیتی ہے کیا کیا نگاہِ یار مجھے
اب اس کے بعد گلہ کس سے کیجئے کس کا — تسلّیوں نے کیا اور بے قرار مجھے
سُنا رہی ہے تبسّم کی تیرے رنگینی — فسانۂ چمن آرائیِ بہار مجھے
ہوا ہے زخمِ جگر تک خمار آلودہ — نہ دیکھ اپنی نگہِ مست بار بار مجھے

وہ سرخوشِ مئے عرفان و بیخودی ہوں اثر
کہ اہلِ ہوش بھی کہتے ہیں بادہ خوار مجھے

تجلیات کا عالم تری نقاب میں ہے — اک آفتاب کا پرتو اک آفتاب میں ہے
نہ انتظار کی حد ہے نہ اضطراب کی حد — کہ انتظار اب آغوشِ اضطراب میں ہے
نظارہ شوق میں گُم شوق بے سروساماں — شہود غیب نہیں پھر بھی تو حجاب میں ہے
شگفتگی جسے نسبت ہے تیرے چہرے سے — شراب میں ہے نہ اس حُسن سے گلاب میں ہے

خرام مست ادا مست ہر کرشمہ مست — تمام نشے کا عالم ترے شباب میں ہے
کہے جو زہد وہ سچ میں نے تو یہی دیکھا — کہ ایک شان کرم بھی ترے عتاب میں ہے
سراب جز و حقیقت نہیں تو پھر کیا ہے — حقیقتوں کی نمائش اگر سراب میں ہے

نمود بحر کا ہے راز بھی اسی میں نہاں
شکستگی جو اثر فطرت حباب میں ہے

یاد تیری مئے سر جوش ہوئی جاتی ہے — جو تمنا ہے وہ مدہوش ہوئی جاتی ہے
دور منزل سے ہوئی جاتی ہے دنیا اتنی — جتنی ہی مست مئے ہوش ہوئی جاتی ہے
اور پروانۂ جاں سوز کو کیا داد ملے — شمع اک حسن سے خاموش ہوئی جاتی ہے
کیا کیا اے دل بیتاب کہ اُن کی صورت — اب تصور سے بھی روپوش ہوئی جاتی ہے
اللہ اللہ تری مست نگاہی کا سماں — زندگی لغزش مے نوش ہوئی جاتی ہے
لب نازک پہ تبسم کی وہ ہلکی سی جھلک — تتلی تتلی سے ہم آغوش ہوئی جاتی ہے
راز دنیا کی تباہی کا ہے مضمر اس میں — مستیٔ عشق فراموش ہوئی جاتی ہے
موت سے چند چرائے ہوئے لمحے ہیں کہ زیست — کیا یہ حالت دل غم کوش ہوئی جاتی ہے

ٹوٹی پڑتی ہے تمنا پہ تمنا اب اثر
موج سے موج ہم آغوش ہوئی جاتی ہے

۱۹۴۲ء

رہے جو ہوش تو وہ جانِ جاں نہیں ملتا
بغیر کھوئے ہوئے کچھ یہاں نہیں ملتا

ہزار جلوۂ رنگیں ہزار ذوقِ نظر
بیانِ حُسن کو حُسنِ بیاں نہیں ملتا

وہ اشک جس سے چھلک جائے آنکھ تاروں کی
بغیر لذتِ سوزِ نہاں نہیں ملتا

تری تلاش میں طے کی ہیں بارہا میں نے
وہ منزلیں کہ جنھیں کارواں نہیں ملتا

دلِ خراب کی تسکین کو ہے شورِ طلب
یہ جانتا ہوں کہ وہ بدگماں نہیں ملتا

خدا کے واسطے یہ قید ہے کہ آزادی
چمن میں رہنے کو جب آشیاں نہیں ملتا

پئے سجود ہیں مجھکو وہ رفعتیں درکار
زمیں تو کیسی جہاں آسماں نہیں ملتا

حریمِ قرب کی باتیں ہیں اور دل والے
مگر کسی سے کسی کا بیاں نہیں ملتا

نہ جانے کب سے ہوں سرگشتۂ جستجو میں اثر
بتائے جو مجھے میرا نشاں نہیں ملتا

زباں زباں نہ رہی اور بیاں بیاں نہ رہا
وہ سُننے آئے ہیں جب لطفِ داستاں نہ رہا

ہجومِ شوق میں کھوئی ہوئی تمنائیں
جو ابتدائے محبت میں تھا سماں نہ رہا

کسی نے آگ میں چہرے کو رکھ دیا جیسے — اگر مژہ پہ کبھی اشک خوں فشاں نہ رہا

نہ اب وہ شورِ محبت نہ اب وہ دل والے — متاعِ درد تھی جس میں وہ کارواں نہ رہا

مٹا مٹا کہ مجھے غم نہیں ہے مٹنے کا — رہا رہا نہ رہا نقش رائیگاں نہ رہا

بہار آئی ہے ایسی بہار کیا کہیے — چمن میں اہلِ چمن کا جب آشیاں نہ رہا

خطا معاف گماں کینہ پروری کا ہے — کہ امتحاں کی حدوں میں اب امتحاں نہ رہا

وہی ہے دل وہی نغمات کی فراوانی — حریفِ معنیٔ رنگیں مگر بیاں نہ رہا

یہ سوچنا تھا اثرؔ عرضِ حال سے پہلے
وہ بدگماں تو نہیں ہے جو سرگراں نہ رہا

یہ کون سا طریق ہے ظالم خطاب کا — دم بھر گماں ہو لطف کا دم بھر عتاب کا

لپٹے ہوئے ہیں شعلے دلِ بے قرار سے — ہر داغ ایک گل کدہ ہے التہاب کا

اللہ رے تصورِ جاناں کی محویت — آنکھیں تو ہیں کھلی ہوئی عالم ہے خواب کا

اب میں ہوں اور لذتِ سرشاریٔ مدام — کرتی ہے کام یاد کسی کی شراب کا

آئینہ دیکھتا ہے کبھی اس طرف بھی دیکھ — میری نگاہ عکس ہے تیرے شباب کا

تعمیر میں فساد ہے ترتیب میں شکست — دنیا ہے نام ایک بنائے خراب کا

ق

جلوہ دکھا کے چھپتی ہے قوسِ قزح ہنوز — تصویرِ حسن پھول ہو اب تک گلاب کا

لبریز انبساط ہے تاروں کی انجمن — گاتی ہے موجِ بحر ترانہ شباب کا

ہر صبح مہر ہوتا ہی اس طرح جلوہ گر   جیسے چھلک رہا ہو پیالہ شراب کا
لیکن بشر کہ جس کے لئے ہے یہ اہتمام   غفلت سے ہے شکارِ غم حساب کا

صورت بھی واقعات کی بدلی تو کیا اثر
مرکز اگر ضمیر نہیں انقلاب کا

پاس تھا اک دل ہجر کا مارا   آج کیا اُس نے بھی کنارا
تم نہ ہمارے دل نہ ہمارا   ڈھونڈیں تو ڈھونڈیں کس کا سہارا
اس میں بھی ہے تم کو تامل   نیم تبسّم ایک اشارا
جس نے لگائی عشق کی بازی   تن، من دھن سب کچھ ہارا
موہ لے دل کو باتیں ایسی   لیکن ظالم تاہم پیارا
صبر کہ جس پر ناز تھا دل کو   دل کو وہ لے کر ساتھ سدھارا
ہم ہیں اسیرِ دامِ محبت   دل ہے کسی کا لوٹا مارا

حُسن ہے کیا شے پوچھو اثر سے
اپنی نظر کا آپ نظارا

مٹے ہوؤں کے مٹانے کا اہتمام کیا   یہ ماورائے ستم ہے جو تم نے کام کیا
فلک نے کر دیا چھلکے سے زہرِ غم شامل   مئے نشاط سے لبریز جس نے جام کیا
یہ جانتے ہوئے قدر وفا نہیں ہوتی   تمام عمر یہی اک خیال خام کیا
بغیر خواب وہ آنکھیں میں خواب آلودہ   نگاہِ شوق کا جو کام تھا وہ کام کیا

ترے جمال سے آرائشِ سحر کر کے — ترے خیال سے روشن سواد شام کیا
وہ دل کہ خون ہوا ضبطِ عشق کے ہاتھوں — اُسی کو زینتِ گلدستۂ دوام کیا

بجا ہے غصہ، مجھے خود یہی اچنبھا ہے
کہ اُس کے لہجے میں اُس سے اثر کلام کیا

سراپا بطرزِ نو

یاد آگیا پھر اک بُتِ رعنا غضب غضب — رنگیں تمام کیف سراپا غضب غضب
سج دھج نرالی وضع انوکھی ادا نئی — آواز، جیسے گیت سُریلا غضب غضب
لہجے میں لوچ لوچ میں اک نرم زیر و بم — لہرا بجائیں جیسے کنھیا غضب غضب
آنکھوں میں نیند نیند میں ڈورا خمار کا — نازک سے آبگینوں پہ مینا غضب غضب
وہ پتلیاں کہ مانسرودر کی جھیل میں — ہنسوں کی ناؤ کھیتے ہوں ڈوبتا غضب غضب
ابرو وہ بانکے بات پہ تلوار سونت لیں — اور کردیں ایک لیکھا نہ دیکھا غضب غضب
پلکیں گھنیری گوپیوں کی ٹوہ کے لئے — رادھا کے جھانکنے کا جھروکا غضب غضب
اور اُن کی اور چھور وہ چت چور چتونیں — لوٹیں۔ مگر ذرا جو ہو کھٹکا غضب غضب
اُن پتلیوں میں پل کے جواں ہوں جو مستیاں — اُن مستیوں کا کیا ہی ٹھکانا غضب غضب
پھیلا ہوا وہ آنکھوں میں کاجل کہ ہائے ہائے — جیسے کنول کی آنکھ میں بھونرا غضب غضب
مدھ کی کٹوریوں میں وہ امرت گھلا ہوا — جس کا ہے "کامدیو" بھی پیاسا غضب غضب

اُن لمبے لمبے بالوں میں گھونگھر کی لہر سی
کروٹ سے جیسے بہتی ہے گنگا غضب غضب

اُن گورے گورے گالوں پہ اک لٹ لٹکتی ہوئی
فوراً تھا چہرہ لال بھبھوکا غضب غضب

وہ ہونٹ جن کو چوم رہی تھی شگفتگی
یاقوت اتنا سُرخ نہ چوکھا غضب غضب

وہ چلبلی ادائیں اداؤں کے ساتھ ساتھ
نتھنوں کا بار بار پھڑکنا غضب غضب

اپنی ہنسی پہ غصہ، کبھی غصے پر ہنسی
سونا لٹا دیا کبھی رو پا غضب غضب

اُف اُف وہ پور پور میں مہندی رچی ہوئی
ٹیسو کا پھول دیکھا تو ہوگا غضب غضب

اس واسطے چنگیر ہتیلی کی دیکھ لوں
انگڑائی توڑنے کا بہانا غضب غضب

بھڑکا رہی تھی حُسن کو گرمی شباب کی
کھنچتا تھا عطر یا تھا پسینا غضب غضب

اک تشنہ کام شوق کی حسرت بھری نظر
دل بے قرار عرض تمنا غضب غضب

بہکے ہوئے سوال کا بہکا ہوا جواب
اُس پر دبا کے ہونٹ وہ کہنا "غضب غضب"

وہ التفات بخشش بے حد کہیں جیسے
پُرسش کے بعد رنجش بیجا غضب غضب

گفتار کوشیٔ لب میگوں کے ساتھ ساتھ
شرمندگی، حیا کا تقاضا غضب غضب

بیتابیوں نے ہوش سے بیگانہ کر دیا
برہم ہوئی وہ بزم تماشا غضب غضب

اوجھل ہوا نگاہ سے وہ جان آرزو
محرومیاں ہیں اور دل شیدا غضب غضب

جوشِ جنوں میں وہ بھی آخر چاک ہو گیا
ہلکا سا رہ گیا تھا جو پردا غضب غضب

کچھ اُن کا ہوش اور نہ اپنی خبر ہے آج　　ترتیب انتظار بطرزِ دگر ہے آج
پُرسش گہہِ نیاز میں کس کا گزر ہے آج　　نقشِ حیات حلقۂ بیرونِ در ہے آج
شاید کہ ختم ہو گئی حد انتظار کی　　دل اضطراب گشتۂ ذوقِ خبر ہے آج
اک موج نور سلسلہ جنبانِ نور ہے　　پرتوِ نگاہ دوست کا اپنی نظر ہے آج
چلتا نہیں ہے کام تمنا کئے بغیر　　کیوں اتنی دلنواز تری رہگزر ہے آج
شوریدگی و اذنِ نظارہ بقدرِ ذوق　　درپیش امتحانِ عیارِ نظر ہے آج
کس سے کہوں مقام تھا اک دن کنارِ دوست　　رکھا ہوا جو اپنے ہی زانو پہ سر ہے آج
میری جبیں کی خیر ترے سنگِ در کی خیر　　میری جبیں ہے اور ترا سنگِ در ہے آج

اس میں ضرور ایک نہ اک پیچ ہے اثر
مائل جو آشتی پہ بتِ فتنہ گر ہے آج

اسوائے ذوقِ غم شاید نہ تھا کچھ دل کے پاس
تشنہ کامی بڑھ گئی پہنچا جو میں ساحل کے پاس

اُس نے توکب کی مری جانب سے آنکھیں پھیر لیں
بجلیاں سی کوندتی ہیں پھر بھی اکثر دل کے پاس

ہوشیار اے جادہ پیمائے محبت ہوشیار
قافلے منزل میں لٹتے ہیں کبھی منزل کے پاس

اے جنوں شوریدگی کم کر کہیں ایسا نہ ہو
ہر بگولہ شعلۂ رقصاں بنے محمل کے پاس

ہائے وہ بسمل کہ جس کے دل کی طاقت دے جواب
جب پہنچ جائے تڑپ کر دامنِ قاتل کے پاس

کچھ تو ہے جس کے لئے کرتا نہیں ترکِ سوال
ورنہ ہے کونین کی دولت ترے سائل کے پاس

شمع ہو آئینہ ہو گل ہو کہ دل والا کوئی
جو تری محفل سے اٹھا رہ گیا محفل کے پاس

رات اپنا ہی یہ مصرع پڑھ کے روتا تھا اثر
ایک دل غمخوار تھا سو رہ گیا قاتل کے پاس

مسلسل

غمِ حرماں کی قسم جانِ پُر ارماں کی قسم
دل سے نکلے ہوئے نغماتِ پریشاں کی قسم

گو دلِ زار پہ ہر لحظہ قیامت گزری
تجھ کو بھولا نہیں طولِ شبِ ہجراں کی قسم

میرے ہر اشک میں تھی تیرے تبسم کی جھلک
شبنم آلودگیٔ صبحِ گلستاں کی قسم

جس کو بخشی تھی ضیا حسرتِ خوں گشتہ نے
آنکھ سے ٹپکے ہوئے اشکِ پشیماں کی قسم

خوش نگاہی کے تری جس میں رقم تھے اوصاف
دلِ صد پارہ کے اوراقِ پریشاں کی قسم

مجھکو ہر پھول سناتا تھا فسانہ تیرا ۔ تیرے دامن کی قسم اپنے گریباں کی قسم
میری ہر سانس جراحت تھی جراحت میں مزا ۔ خم ابرو کی قسم جنبش مژگاں کی قسم
گونجتا رہتا تھا اک نغمہ مرے کانوں میں ۔ تپش آہنگیٔ مضراب رگِ جاں کی قسم
التفاتِ نگہِ ناز کا سودا تھا کبھی ۔ ختم وہ دور ہوا گردشِ دوراں کی قسم
اب نہ وہ دل ہے نہ وہ ولولۂ عرضِ نیاز ۔ ہاتھ سے چھوٹے ہوئے گوشۂ داماں کی قسم
ذوقِ فریاد نہ اندوہ گراں جانی ہے ۔ خوش بہرحال ہوں محرومیٔ درماں کی قسم
مجھکو بربادی رہنے دے تلافی سے گزر ۔ عشق احساں ہے گراں باریٔ احساں کی قسم
ادب آموز محبت ہے محبت میری ۔ ورنہ کھاتا ترے توڑے ہوئے پیماں کی قسم

فکر کی پستی تھی جس کو آسماں سمجھا تھا میں ۔ گرد راہ کارواں تھی کہکشاں سمجھا تھا میں
لمحہ لمحہ زندگی کا تھا ہم آغوشِ دوام ۔ وقت کو اک طائرِ بے آشیاں سمجھا تھا میں
موت ہے دراصل ہستی سلسلہ در سلسلہ ۔ وہ تھی بیداری جسے خوابِ گراں سمجھا تھا میں
اک فسانہ بن گیا ہنسنے ہنسانے کے لئے ۔ اشک جس کو بیکسی کی داستاں سمجھا تھا میں
تیری پرسش، میری خاموشی خطا کر دے معاف ۔ عشق کی خودداریوں کا امتحاں سمجھا تھا میں
لو ہوئی تردید برائل وہ چشمِ فتنہ ساز ۔ اپنی خاموشی کو اک طرزِ فغاں سمجھا تھا میں
اُن غلط انداز نظروں کو نشانہ مل گیا ۔ اپنی ہستی کو متاعِ رائگاں سمجھا تھا میں
نغمہ کہتے ہیں کسے سمجھا تھا میں پہلے پہل ۔ جب تری آنکھوں کا اندازِ بیاں سمجھا تھا میں

اب کھلا بے ربط کچھ ٹکڑے بھی شامل ہو گئے
زندگی کو اک مسلسل داستاں سمجھا تھا میں

جب ہوئی بیگانہ ذوقِ خود شناسی سے خودی
گمرہی ہوگی اسیرِ کارواں سمجھا تھا میں

بات سمجھانے کی ہو تو کوئی سمجھائے اثر
اک معما بن گیا جو کچھ یہاں سمجھا تھا میں

اشکِ گل رنگ نثارِ غمِ جانانہ کریں
آج تیری ہی خوشی اے دلِ دیوانہ کریں

دردمندوں سے یہ کہہ دو کہ بآئینِ نیاز
دل کو ذوقِ کرمِ یار سے بیگانہ کریں

تاکہ آسودۂ حرماں دلِ غم کوش نہ ہو
دو گھڑی ذکرِ مے و ساقی و پیمانہ کریں

بوئے خوش تیری نہیں جن کے مشامِ جاں میں
رنگِ نکہت کا گلوں کو وہی پیمانہ کریں

کعبہ و دیر و کلیسا کی فضاؤں سے الگ
آؤ تعمیرِ محبت کا جلو خانہ کریں

اتنی فرصت ہی کہاں ہے کہ ترے سوختہ جاں
جلنے مرنے میں ہم آہنگیٔ پروانہ کریں

غور کا وقت گیا کام کا ہنگام آیا
مشورہ ہم سے اگر عاقل و فرزانہ کریں

اپنی ہستی کی فقط اتنی ہے روداد اثر
جیسے منسوب حقیقت سے اک افسانہ کریں

جادۂ ہستی بجز پالغزِ مستانہ نہیں
تندیٔ صہبا اسیرِ خطِ پیمانہ نہیں

کیا کوئی اب محرمِ اسرارِ میخانہ نہیں
چال مستانہ نہیں گفتار رندانہ نہیں

تن بدن میں شمعِ سوزاں کے جو بھر دے مستی
جذب اتنا بھی نہ ہو جس میں وہ پروانہ نہیں

ایک شوق بے نہایت مرحلہ در مرحلہ
منزلِ مقصود کعبہ یا صنم خانہ نہیں

ہوش والے بادۂ گلگوں کے متوالے رہیں — عشق کی مستی رہیں دورِ پیمانہ نہیں
نغمۂ جاوید سنتا ہوں ربابِ زیست پر — شورِ مستی و عدم خبر ہوئے مستانہ نہیں

اتنی فرصت ہی کہاں ڈھونڈے جو ویرانہ کہیں
اپنے دل سے باتیں کرتا ہوگا دیوانہ کہیں

شب کا سناٹا، دھڑکتا دل۔ یہ ہوتا ہے گماں
کوئی کہتا ہے تری الفت کا افسانہ کہیں

اللہ اللہ اے فلک یہ تفرقہ پردازیاں
شمع جلتی ہے کہیں جلتا ہے پروانہ کہیں

رند تارک ہوں مگر اتنا علاقہ ہے ابھی
بوئے مے آتی ہے کھلتا ہے جو میخانہ کہیں

بن گیا میرا تبسم جس کا پردہ بارہا
کہہ نہ دیں حسرت بھری نظریں وہ افسانہ کہیں

آج اخترؔ پھر اُس طرف جاتے ہوئے دیکھے گئے
چھوٹتا ہے ایسے کافر سے صنم خانہ کہیں

خیالِ منزل میں دُھن کے پکّے بڑھا کئے ہیں بڑھا کریں گے
گلہ مقدر کا پست ہمت کیا کئے ہیں کیا کریں گے

فنا سے ٹکرا کے زندگی کو ہنسا کئے ہیں ہنسا کریں گے
جو مرد ہیں وہ یونہیں ہمیشہ جیا کئے ہیں جیا کریں گے

سمجھ میں جن کی یہ راز آیا کہ جس نے کھویا اُسی نے پایا
وہ فکر ساحل سے بے تعلق رہا کئے ہیں رہا کریں گے

یہ لوگ جو ہیں خراب اُلفت چڑھائے جام شراب اُلفت
زمانے کو درس ہوش و مستی دیا کئے ہیں دیا کریں گے

فغان مظلوم وہ نہیں ہے کہ آ کے لب تک فضا میں گم ہو
تمام ارض و سما کے ساکن سُنا کئے ہیں سُنا کریں گے

شکستہ دل ہوں فسردہ خاطر مگر لبوں پر جو ہے تبسم
مخالف اُس سے نہ جانے کیا کیا کہا کئے ہیں کہا کریں گے

نہ جاؤ شرم و حیا پہ اُس کی کہ ایک یہ بھی ادا ہے اُس کی
نگاہ اُٹھے نہ اُٹھے فتنے اُٹھا کئے ہیں اٹھا کریں گے

شفق سے آنکھیں لڑا لڑا کر مہک مہک کر لہک لہک کر
سحر کے پیغام پر شگوفے کھلا کئے ہیں کھلا کریں گے

صدف ہے محتاج ابر نیساں یہاں ہے فیضان عشق و وجداں
اثر کی طبع رواں سے موتی رُلا کئے ہیں رُلا کریں گے

محبت ہے سرمایۂ زندگانی
حقیقت بس اتنی ہے باقی کہانی

تجاہل تغافل ستم سرگرانی
یہی عرف خوباں میں ہے مہربانی

بایں نامرادی بایں خستہ جانی
ترے غم میں ہے اک عجب شادمانی

کہا اک قسلن ہنے کوئی نہ سمجھا
ثبات نفس تک ہے انسان فانی

دل آزردگان محبت کو پوچھا
بڑی مہربانی بڑی قدردانی

جو تیرے تبسم میں پائی گئی ہے
کہاں موجِ رنگِ گل میں ایسی روانی

حیا پروری دیکھ کر اُس نگہ کی
سحر ہو گئی شرم سے پانی پانی

محبت کا جب داؤں ہم نے لگایا
ہوئی جیت اپنی مگر ہار مانی

کلی نے کہا پھول سے یہ چٹک کر
نہ میں جاودانی نہ تو جاودانی

اثرؔ حل نہ ہوتا معمائے ہستی
محبت نہ کرتی اگر ترجمانی

وہ نغمہ مطرب کہ زندگی کو جو سر بسر اضطراب کر دے
دلوں میں کیف و سرور بھر کر لہو کو تن میں شراب کر دے

غلط ہیں راہیں جو چل رہا ہے کہیں بدلتا ہے یوں زمانہ
خیال تحریک ہے عمل کی خیال میں انقلاب کر دے

رواں جو ہونا ہے سوئے منزل نفس کو شعلے سے ہمعناں کر
یہ رنگ سرگرمیٔ طلب ہو کہ دم بھی لینا عذاب کر دے

جو صبح کا منتظر رہا ہے وہ سو گیا ہے وہ کھو گیا ہے
سحر کو پردے سے کھینچ باہر ستاروں کو آفتاب کر دے
یہ دیکھنا کوئی دیکھنا ہے کہ جو دکھایا گیا وہ دیکھا
نظارہ اتنا تو دیدہ ور ہو کہ حسن کو بے نقاب کر دے
جنوں کو رہبر بنا خرد کا خرد ہمیشہ مآل بیں ہے
یہ تیرے پائے طلب کو اک دن کہیں نہ سرمست خواب کر دے
صلاح و تقوے تمہیں مبارک مجھے تلاش ایسے رند کی ہے
جو حرص و خواہش کی اندھی دنیا کو غرق صہبائے ناب کر دے

نوید وصل یار آئے نہ آئے — برابر ہے بہار آئے نہ آئے
تجھے کرنا ہے جو کچھ آج کر لے — کہ پھر یہ روزگار آئے نہ آئے
کہے جا دردِ دل اے نامرادی — کسی کو اعتبار آئے نہ آئے
کوئی پرساں نہ ہو جب حال بد کا — تمنا سوگوار آئے نہ آئے
جو وہ بالفرض ہو پرسش پہ مائل — دلِ بسمل قرار آئے نہ آئے!
ستم سے جب تلافی ہو ستم کی — تمہیں کہہ دو کہ پیار آئے نہ آئے
اثر ہے اور لذت بے خودی کی
وہ جان انتظار آئے نہ آئے

پاؤں میں چھالے راہ میں کانٹے آنکھ تلے اندھیارا ہے
ڈوبتے دل کی آس نہ توڑو ہار کے تم کو پکارا ہے

آنکھ کسی سے چار نہ ہوگی رحم اے گریۂ ناکامی
اشک پلک سے ٹپکا تو پھر موتی ہے نہ ستارا ہے

عزت کھونا ذلت سہنا حال ستمگر سے کہنا
سچ ہے لیکن اے دل اس کے سوا کیا چارہ ہے

معرکۂ دار محبت میں یہ رسم ہے جاری مدت سے
ہارنے والا ہے جیتا ہے جیتنے والا ہارا ہے

دھیان ہے جس کا یاد ہے جس کی ایک وہی آگاہ نہ ہو
کہنے سے حاصل اُس پہ ہے روشن حال اثر جو تمھارا ہے

اک چھلکتا ہوا جام آنکھ ملا کر ساقی — جس کے ہر قطرے میں ہو صبح کا جوہر ساقی
رنگ بن جائے پری اور پری ہو رقصاں — اس قدر تیز چلے دور میں ساغر ساقی
اپنی توڑی ہوئی انگڑائی کی ہے تجھکو قسم — جام اُسی کن سے ادھر ہاتھ بڑھا کر ساقی
کسی ترکیب سے حل کردے تبسم اپنا — یوں ہنس... ہونٹوں کے لے جا کے برابر ساقی
میں بہکتا ہوں جبھی تک کہ نہیں پیتا ہوں — بند مجھ پر تو نہ کر میکدے کا در ساقی
پھر وہی ہم ہوں وہی شیوہ ہو پاکی اپنا — ق آنکھ جب روتی نہ تھی دامن تر پر ساقی

دے وہ بادہ کہ غم دہر فسانہ ہو جائے　　دل کے مانند فضا بھی ہے مکدر ساقی
رحم فرما کہ یہ ہے تیرہ شبی کا عالم　　ضو نہیں دیتے چراغ مہ و اختر ساقی

چشمک برق نہ پرواز شرر ہوتی ہے　　زندگی درس پئے اہل نظر ہوتی ہے
شوق ہوتا ہے اب اس حسن سے صورتگر شوق　　کہ نظر محو تماشائے نظر ہوتی ہے
ہر ادا چاہتی ہے پہلے مرا دار چلے　　دل کی جانب جو حسینوں کی نظر ہوتی ہے
دل پہ جو گزرے مگر اُف نہ زباں پر آئے　　الغرض خوب محبت میں بسر ہوتی ہے
جب سے دیکھا ہے ترا جلوۂ زیبا میں نے　　زندگی خواب کے عالم میں بسر ہوتی ہے
اور بڑھتا ہے کچھ احساس الم اُس کے بعد　　زندگی چین سے دم بھر جو بسر ہوتی ہے
اب جہاں ڈھونڈوں ترے نقش قدم ملتے ہیں　　اب جدھر جاؤں تری راہگذر ہوتی ہے
اُن سے کہہ دو جو گلہ کرتے ہیں محرومی کا　　اس کی تقریب بعنوانِ دگر ہوتی ہے
دیکھنا منتظر آنے تو دو اس کا پیام　　کس قدر بے خبری وقت خبر ہوتی ہے

غم دوری کی خلش ذوق حضوری کے ساتھ
کیوں آخر دل کی یوہیں دل کو خبر ہوتی ہے

خود ہی اُس بزم سے اُٹھ آئے ہیں جائے نہ بنے　　پوچھ بیٹھے تو کوئی وجہ بتائے نہ بنے
شورش عشق جنوں ساز الٰہی توبہ　　تم بھی چاہو تو یہ ہنگامہ دبائے نہ بنے
ہائے وہ لطف جو آلودۂ بیداد بھی ہو　　حال یوں پوچھ رہا ہے کہ سنائے نہ بنے

وعدہ کرنے کا یہ انداز نرالا دیکھا
کہ اگر چاہو تو پھر یاد دلائے نہ بنے

رسمِ الفت کی نباہیں تو نباہیں کیونکر
وہ بلائے نہ ہمیں، آپ سے جائے نہ بنے

دور سے بھی جو تری نکہتِ خوش آ جائے
ہوش اُڑیں ایسے کہ پھر ہوش میں آئے نہ بنے

اُس کا کہنا کہ جو کہنا ہے کہو جلد یہاں
بات کا طول کسی طرح گھٹائے نہ بنے

زندگی نغمہ ہے لیکن وہ انوکھا نغمہ
کوئی دُھن چاہو بٹھانا تو بٹھائے نہ بنے

تیرے وعدوں سے تسلی نہیں ہوتی دل کی
عشق کی پیاس ہو اوسوں پہ بجھائے نہ بنے

داغ دھو جائے غلامی کا اگر ہمت ہو
خطِ تقدیر نہیں ہے کہ مٹائے نہ بنے

عشق کا راز چھپائے سے کہیں چھپتا ہو
کوئی پوچھے تو بجز سر کو جھکائے نہ بنے

جب سے تری مرضی مجھے معلوم ہوئی ہے
تقدیر بھی تدبیر کی محکوم ہوئی ہے

اتمام ترا کام ہے اور سعی مرا کام
سو بات کی اک بات یہ معلوم ہوئی ہے

یارب یہ ہوا کیسی چلی باغ جہاں میں
خود زیست بھی اک پیکرِ مسموم ہوئی ہے

خواہش ہے نہ کاہش ہے نہ حسرت نہ تمنا
یہ کیا تری حالت دلِ مغموم ہوئی ہے

آسودگیِ غم میں بھی اک گونہ فراغت
سو وہ بھی اب اس عہد میں معدوم ہوئی ہے

دھندلا سا کوئی عکس کہ مبہم سا اشارہ
روداد محبت کہیں مرقوم ہوئی ہے

آکر مری اُجڑی ہوئی بستی کو بسا دے
اب یاد تری نکہتِ موہوم ہوئی ہے

پھولوں میں ہے تاروں میں نہ شبنم میں نہ سحر میں
وہ خوش نظری تجھ سے جو موسوم ہوئی ہے

اللہ ری بد آموزیِ آئینِ سیاست
افسانہ اثر فطرتِ معصوم ہوئی ہے

سنہ ۱۹۴۳ء

بس ایک شوق تھا جو شوق کے مقابل تھا
جہاں عشق میں لیلیٰ تھی اور نہ محمل تھا

اک اضطرابِ سراسیمگی کا حاصل تھا
نظر کے سامنے جب تک حجابِ منزل تھا

کہاں سے لائیے اب اے ہجومِ تشنہ لبی
وہ بوسہ جس میں تبسم کا شہد شامل تھا

نہ جا شکست پہ میری کہ میں بھی مثلِ حباب
وہ قطرہ ہوں جو کبھی بحر کے مقابل تھا

مذاقِ عشق تھا جب تک حریفِ لذتِ غم
مرا خیال بھی نا آشنائے حاصل تھا

غرورِ حسن کو محکومِ ناز کر دینا
بغیر کاہشِ عرضِ نیاز مشکل تھا

کبھی کھلا نہ اثر عقل کے مریدوں پر
کہ گمرہی کا سبب اعتبارِ منزل تھا

روداد محبت نہیں اب اس کے سوا یاد
سو بار بھلایا اسے سو بار کیا یاد

پامالئ حسرت کا گلہ کیجئے کیونکر
اک وعدۂ پشیماں کا ہے اندازِ حیا یاد

دل مائلِ فریاد ہے خاموش زباں ہے
کرتا ہوں ستم یاد تو آتی ہے وفا یاد

ہمدم اسی امید میں اک عمر گزاری
پر مجھکو نہ اس نے کبھی بھولے سے کیا یاد

ہر جبر نزیرا ہو تو ہر جور گوارا
اے عشق یہ ہے شیوۂ اربابِ وفا یاد

تصویر تھی جو حُسن کی بے ساختہ پن کی
اب تک ہے ستمگر کی وہ مستانہ ادا یاد

ساغر کی طرح خون کھنکتا تھا رگوں میں
آتا ہے وہی دورِ مئے ہوش رُبا یاد

کیا سچ ہی اثر تا کہ ہوا اُس در پہ سائی
کرتے ہوا کیلے میں فقیروں کی صدا یاد

مسلسل

چلا چل محبت بھرے دل چلا چل
ابھی دور ہے تیری منزل چلا چل

ہوائیں مخالف ہوں دنیا مخالف
اگر ہے ترا شوق کامل چلا چل

کہاں ناخدا اور کیسا سفینہ
بنا موجِ طوفاں کو ساحل چلا چل

تجلّی سے عالم کو معمور کر دے
یہی ہے محبت کا حاصل چلا چل

قدم لڑکھڑائیں جو راہِ وفا میں
باندازِ رفتارِ بسمل چلا چل

حدودِ زمان و مکاں سے گزر جا
نہیں تیرے درخور یہ محفل چلا چل

اشارات میں کس لئے گھر گیا ہے
ستارے بھی ہیں گردِ محمل چلا چل

خودی بیخودی تو ہے دونوں سے بالا
یہ پردے ہیں مابین حائل چلا چل

بشرطیکہ شیوہ وفا و صفا ہے
ہر اک رنگ میں ہو کے شامل چلا چل

یو ہیں منزلِ دوست بھی مل رہے گی
جہاں تک چلا جائے اے دل چلا چل

میں ہوں اور تیری محبت ہے محبت کی قسم
غم بھی اب وجہ مسرت ہے مسرت کی قسم

دہر اک خواب پریشاں کے سوا کچھ بھی نہ تھا
عشق عرفانِ حقیقت ہے حقیقت کی قسم

اب شکایت ہے تری اور نہ قسمت کا گلہ
اک فقط شوق ملامت ہے ملامت کی قسم

لاکھ پامال ستمہائے تمنا ہوں میں
تلخیوں میں بھی حلاوت ہے حلاوت کی قسم

نگہِ لطف کی پرسش پہ خموشی میری
ایک اندازِ ندامت ہے ندامت کی قسم

ہاں کبھی دل تھا صنم خانہ تمناؤں کا
اب پرستارِ محبت ہے محبت کی قسم

ایک جھنکار بھی ہے سازِ شکستِ دل میں
پر ترا پاس نزاکت ہے نزاکت کی قسم

عظمتِ عشق سے واقف نہیں تم ورنہ اثر
اک گراں مایہ ودیعت ہے ودیعت کی قسم

ہزار جلوے نو بہ نو نئے ہوئے کنار میں
نظارہ کھو گیا ہے آپ اپنے انتظار میں

یہ سچ ہے ختم ہو گیا وہ دورِ شوق و بیخودی
بھری ہیں پھر بھی لذتیں شراب کے خمار میں

نظر کے سامنے جو ہے نہیں نظر کے سامنے
تمام خواب کا سماں ہے تیرے انتظار میں

ہزار حوصلہ شکن ہیں دھندلے دھندلے راستے
ترا خیال رہنما ہے دشت بے دیار میں

شراب کہنہ جب ہوئی تو نشہ تیز ہو گیا
مزا ہے اضطراب میں کبھی جو تھا قرار میں

فریب ممکنات ہیں تغیرات ماسوا
حیات ہی حیات ہے نگاہِ اعتبار میں

ق

خزاں کے دست جور سے جو منتشر تھیں نکہتیں
سمٹ کے آ گئیں وہ سب نسیم کے کنار میں

سحر لئے ہے جام زر چمن ہے یا ہے میکدہ
بجائے آب مستیاں بھری ہیں جوئبار میں

قابلِ عفو ستمگر کی جفائیں نکلیں — ایک ہم ہیں کہ وفائیں بھی خطائیں نکلیں

دیکھ تو اپنے تغافل کی ذرا پردہ دری — عشق میں حُسن کی مستانہ ادائیں نکلیں

ہجر کی رات بسر ہو تو گئی سچ ہے مگر — سونی سونی سی دمِ صبح فضائیں نکلیں

جامہ زیبی کا تری طرز اُڑانا چاہا — دیکھتے دیکھتے غنچوں کی قبائیں نکلیں

دیکھئے اور دکھاتی ہے محبت کیا کیا — آج دشمن کیلئے دل سے دعائیں نکلیں

آہ وہ ذکرِ وفا پر یہ کسی کا کہنا — دیکھ لو پھر وہی رنجش کی بنائیں نکلیں

زلف اُس رُخ پہ اس انداز سے بکھری کہ اثر
کرنیں مہتاب کی لینے کو بلائیں نکلیں

نہ شرحِ شوق نہ تسکینِ جانِ زار میں ہے — مزا جو اپنی محبت کے اعتبار میں ہے

ابھی سے ہوش نہ کھو بیٹھ اے نسیمِ چمن — ابھی تو ایک شکن زلفِ تابدار میں ہے

خود اپنے عشق کی رنگینیوں میں گم ہو جا — نہیں کچھ اور اگر یہ تو اختیار میں ہے

یہ محویت کوئی دیکھے کہ مثلِ آئینہ — جنونِ خود نگری اپنے انتظار میں ہے

نہ بے نصیب ملی اور بقدرِ ظرف ملی — سپردگی کی جو اک شان اختیار میں ہے

حریفِ بزمِ تماشا تری نگاہ نہیں — وگرنہ حُسن تو خود تیرے انتظار میں ہے

اثر مجھے ہے وہاں رخصتِ نوا سنجی
کہ نغمہ اک لبِ خاموش جس دیار میں ہے

حال وہ پوچھے بھی کہا بھی جائے — ہم سے جب آپ میں رہا بھی جائے

پھر ٹھکانا نہیں ہے لذت کا
آدمی سے جو غم سہا بھی جائے

اُس کی زلفوں کی طرح لہراتی
بہہ تو موج پر بہا بھی جائے

دردِ دل وہ سُنے ضرور سُنے
دردِ دل ہم سے جب کہا بھی جائے

ہے ملامت تری بجا ناصح
بن گئے اُس طرف رہا بھی جائے

شعر اندازِ میرؔ میں کہنا
چاہتے ہیں سبھی کہا بھی جائے

کوچۂ عشق ہے یہاں جو اثرؔ
"آئے تو لو ہو میں نہا بھی جائے"

کیا یہ سچ ہے کہ نئی طرزِ جفا سے پہلے
مشورے ہوتے ہیں خلوت میں حیا سے پہلے

گونجتا ہے دلِ مشتاق کے ہر پردے میں
نغمۂ جنبشِ لب تیری صدا سے پہلے

پھول اس حُسن سے آلودۂ شبنم نہ ہوا
رنگ دیکھا ترے عارض کا حیا سے پہلے

روئیے اُس کو بہت موت ہے دراصل یہی
زندگی ختم جو ہو جائے قضا سے پہلے

عشق کا نام نہ لے عشق کو بدنام نہ کر
درد کو دردِ بنا فکرِ دوا سے پہلے

اب یہ انداز ہے محرومیٔ ناکامی کا
دل سے فریاد نکلتی ہے دُعا سے پہلے

کتنے ہی نغمے فقط ایک خموشی میں ہیں
کان مانوس تو ہوں اُن کی صدا سے پہلے

میں اُسے شعر سمجھتا ہی نہیں جس میں اثرؔ
حُسنِ تخئیل نہ ہو حُسنِ ادا سے پہلے

۱۹۴۴ء

رحم پر غیر کے جینا کیسا — زندگی کا یہ قرینا کیسا
کچھ تو ہے پاس وفا کا لازم — دشمنی غیر یہ کینا کیسا
دست ساقی سے اگر مل جائے — زہر امرت ہے نہ پینا کیسا
ٹوک طوفان کو موجوں سے اُلجھ — ناخدا کون سفینا کیسا
جوش جس دل میں نہ ہو دل ہی نہیں — جس میں صہبا نہ ہو مینا کیسا

سوتے میں ہوتے ہیں اس رُخ کے نظارے کیا کیا
جھولیاں نور سے بھرتے ہیں ستارے کیا کیا

اپنے ہی بوجھ سے اب آپ دبے جاتے ہیں
بازیاں اہل ہوس جیت کے ہارے کیا کیا

کیا وہی ہم ہیں جو رُخ پھیر کے طوفانوں کا
چیرتے بڑھتے تھے بہتے ہوئے دھارے کیا کیا

گھٹنے لگا ہے دم ترا شکوہ کئے بغیر
یہ عشق چین لے گا نہ رسوا کئے بغیر

وہ اک سکونِ زیست کا حاصل کہیں جسے
ملتا نہیں ہے ترکِ تمنا کئے بغیر

کم ظرف ہے وہ غم سے ہو مشکل جسے نجات
غم کو رہین بادہ و مینا کئے بغیر

اے جذبِ شوق مژدہ کہ بنتی نہیں انھیں
پردے میں رہتے اور نہ پردا کئے بغیر

زاہد کو اعتبار ہے فردوس و حور کا
دنیائے رنگ و بو کا تماشا کئے بغیر

اب وہ ہیں اور ماتم آشفتہ خاطری
اُٹھ آئے تیرے در سے جو سجدا کئے بغیر

مسلسل

تجھے دیکھ کر اب جدھر دیکھتا ہوں
خود اپنا فروغِ نظر دیکھتا ہوں

تری خود نمائی اور اپنی خودی میں
عجب ربط باہمدگر دیکھتا ہوں

کوئی خیر و شر دیکھتا ہے مگر میں
پسِ پردہ خیر و شر دیکھتا ہوں

کبھی ہے تبسم میں تیرا نظارہ
کبھی اشک میں جلوہ گر دیکھتا ہوں

سحر کی طرب ناک تابندگی میں
جھلکتے ترے بام و در دیکھتا ہوں

پُر اسرار راتوں کی گہرائیوں میں
نہیں دیکھ سکتا مگر دیکھتا ہوں

گلِ تر کی بیباک انگڑائیوں میں
ترے پردے کو پردہ در دیکھتا ہوں

کبھی بانسری کی سُریلی دُھنوں میں
نوا سنج پچھلے پہر دیکھتا ہوں

کبھی دل کی بڑھتی ہوئی اُلجھنوں میں
کرشموں کا تیرے اثر دیکھتا ہوں

ستارے ہیں شاہد کہ اے ماہِ خوبی | تری راہ میں رات بھر دیکھتا ہوں

درِ دوست پر آج کس نے صدا دی | کہ ہر شے کو محوِ خبر دیکھتا ہوں

خموشی میں لوٹوں مزے گفتگو کے
کوئی کہہ رہا ہے "اثر دیکھتا ہوں"

گماں ہی جس پہ نہ جانے ہو کب کا دارِ محن | بساطِ نغمۂ رنگیں تھا ایک دن یہ چمن

پئے گئے جو محبت کا نام لے لے کر | اُن آنسوؤں کی چبھن اُف اُن آنسوؤں کی چبھن

چمن کی سیر مبارک تمہیں چمن والو | یہاں ہے خار سے اُلجھا ہوا سرِ دامن

یہی جو شانِ کرم ہے ستم گوارا ہے | تری نگاہ نہ تھی پہلے ایسی تاب شکن

رندھی رندھی ہیں فضائیں بجھے بجھے تیور | نثارِ وضعِ گلستاں نثارِ اہلِ چمن

سیاہ تر ہیں شبِ تار سے بھی دن تیرے | وطن وطن مرے بیکس وطن غریب وطن

ابھی تو خون کے سیلاب سے گزرنا ہے | ابھی ہے دور بہت منزلِ بہارِ چمن

ہوا میں ہو گئے تحلیل ڈھل رہے تھے جو خواب | وہی ہیں ہم وہی حرمان و یاس و رنج و محن

نمودِ لالہ و نسریں فقط اشارے ہیں | تری نگاہ نہیں آشنائے رازِ چمن

ق

غزل کو نظم نہ کہیے غزل ہو اور ہی چیز | وہ ہے حیات یہ نبضِ حیات کی دھڑکن

وہاں کلام میں بوئے سمن کی مستی ہے | یہاں کلام سے ہوتی ہے مست بوئے سمن

اثرؔ غریب کلیجے سے ہے لگائے ہوئے
ہزار دشنۂ سر تیز یادگارِ وطن

خیالِ دوست چمن سازِ انتظار رہے
جو کچھ تپش میں کمی جانِ بے قرار رہے

چمن کی جان تھے جو پھول جب چمن میں نہیں
خزاں کا دَور کہ ہنگامۂ بہار رہے

مذاقِ عشق کی تکمیل کو یہ لازم ہے
کہ جبر کے بھی پسِ پردہ اختیار رہے

یہ دَورِ جام یہ گردش نگاہ ساقی کی
وہ ہوشیار نہیں ہے جو ہوشیار رہے

کبھی جھپک نہ سکے چشمِ خواب آلودہ
مری طرح جو ستاروں کو انتظار رہے

یہ سچ ہے منزلِ مقصود کا پتہ نہ ملا
قدم تو راہِ محبت میں استوار رہے

الم نصیب ستم کش خراب و خستہ و خوار
غریب اپنے وطن میں بھی بے دیار رہے

ابھی ہے شوق ترا ناتمام ورنہ اثرؔ
حریفِ بزمِ تماشا خود انتظار رہے

زبانِ میرؔ میں یہ ہے کمالِ عشق اثرؔ
کہ اختیار بھی ہو تو پہ جبر کو مار رہے"

رخصت ہوئے ستارے اک آہ سرد بھر کے
تر کر کے آنسوؤں سے رخسار کو سحر کے

کیا تم کو رشک آیا؟ مجکو تو رحم آیا
لعل و گہر کے مالک محتاج اک اشکِ تر کے

دل کچھ کہے زباں کچھ مطلب ہے کچھ دعا کچھ
یہ حال اور شکوے محرومیٔ اثر کے

کیا پوچھنا ہے اُن کی عشرت پرستیوں کا
گیسو جو رہ گئے ہیں رُخ پر ترے بکھر کے

زیبا ہی جس قدر ہو بادِ بہار نازاں
گل ہے کہ اک دلہن ہے آغوش میں سحر کے

شبنم سے گل خفا ہے گُل سے خفا ہے بلبل
دیکھے کرشمے اُس کی نیرنگیٔ نظر کے!

اس کے سوا نہیں ہے کچھ موت کی حقیقت
جھپکی سی ایک آئی جاگے تھے رات بھر کے

گھبرا کے اندھیرے سے جب تجکو صدا دی ہے
ہر ذرے کے سینے میں اک شمع جلا دی ہے

ہر چند زمانے میں ناشاد نہیں ہم سا
اے دوست ترے غم کی توقیر بڑھا دی ہے

یہ شوق کا عالم ہے یہ شوق کی محویت
خود دل نے پکارا ہی خود دل نے صدا دی ہے

اے بے اثری شاید اب کوئی جواب آئے
زنجیر ستاروں کی آہوں نے ہلا دی ہے

کہتا ہوں اثرؔ کوئی ناراض ہو یا خوش ہو
پیکار یہ آپس کی مذہب نے سکھا دی ہے

سنہ ۱۹۴۵ء

ہجومِ رنج و بلا میں بھی مُسکرائے جا
نیازِ عشق کی رنگینیاں بڑھائے جا

تجلیوں کی ہو بارش جدھر نظر اُٹھے
ضمیرِ عشق میں وہ بجلیاں چھپائے جا

سنبھل سنبھل کے بہک اور بہک بہک کے سنبھل
ہوائے شوق میں سرمستیاں ملائے جا

وہی ہے تو جو تری آرزو کا مرکز ہے
بس اتنا دھیان رہے ماسوا بھلائے جا

ابھی ہے دورِ محبت کی محرمی یعنی
متاعِ ہوش رہِ شوق میں لٹائے جا

وفا کا تجھ سے طلب گار میں نہیں لیکن
حیا کو پردۂ جور و جفا بنائے جا

اضافہ اور حجابوں پہ کر حجابوں کا
مری نگاہ کی وسعت کو آزمائے جا

"صلاح کار کجا و من خراب کجا"
بقدرِ ہوش سراسیمگی بڑھائے جا

تمام حُسن کی دنیا ہو عشق کی دُنیا
حریمِ دل کو اثرؔ اس طرح سجائے جا

اُس لبِ جاں بخش پر اپنا بھی نام آ ہی گیا
شاد باش اے مرگ جینا کچھ تو کام آ ہی گیا

راہ پر اپنی جنوں تیز گام آ ہی گیا
جس کی منزل تھی فنا سوئے دوام آ ہی گیا

حلقۂ بیرون در ہے جس جگہ دورِ فلک — وہ جہانِ بے جہاتِ بے مقام آ ہی گیا
شمع کی تھراتی لَو سے جیسے پروانہ ملے — کانپتے ہاتھوں میں اک میکش کے جام آ ہی گیا
آرہا ہے سر جھکائے اک پشیمانِ ستم — دردمند حسن کا ڈر تھا وہ مقام آ ہی گیا
سعیٔ ضبطِ شوق کے باوصف اُسکے سامنے — میرے لب پر ایک حرفِ ناتمام آ ہی گیا
بے نیاز یہائے ساقی کا گلہ کیوں کیجئے — جھومنا بے منتِ صہبا و جام آ ہی گیا
ربط سے خالی ادھورا بے سبب واسطہ — کچھ کہو، لب پر کسی بیکس کا نام آ ہی گیا
میں کہاں جاؤں چلے طائر نشیمن کی طرف — ڈھل گیا غربت کا دن ہنگام شام آ ہی گیا
اپنی محفل اپنا ساقی اپنا جام اپنا سبو — کیا وہ عہدِ عشرتِ رنگین خرام آ ہی گیا

شاعری سے مَس نہیں لیکن سمجھتے ہیں اثرؔ
"زمزمہ پرداز سدرہ" زیرِ دام آ ہی گیا

وہ آیا مست و بیتابانہ آیا — حریمِ شعلہ میں پروانہ آیا
فلک سے اک ستارہ گھٹ گیا ہے — کفِ میکش میں جب پیمانہ آیا
نقابِ ازلی جلوے نے رُخ پر — یہ کون اس بزم میں بیگانہ آیا
جفا جو ہے کرم ناآشنا ہے — یہ تو کس پر دلِ دیوانہ آیا
نہ سُننے کو بہانہ نیند کا ہے — ذرا جب رنگ پر افسانہ آیا
ہوئی حیرت گریباں گیر کیا کیا — کبھی جو ہوش میں دیوانہ آیا
نہ وہ دل ہے نہ وہ جوشِ تمنا — برابر ہے کوئی آیا نہ آیا

اُڑے گا نشہ ہر سو رنگ بن کر
اثرؔ کے ہاتھ میں پیمانہ آیا

تڑپنا زیرِ شمشیرِ ستم رہ رہ کے بسمل کا
ادب گاہِ محبت میں گلہ ٹھہرا ہی قاتل کا

نویدِ امن سم تھی خوگرِ آفات کے حق میں
بہا کر لے گیا ساتھ اپنے جھونکا موجِ ساحل کا

درِ منعم پہ آیا تھا ندامت مانگنے شاید
عرق آلودہ ہونا کہہ رہا ہے روئے سائل کا

طریقِ عشق کے رہرو اُسے گمراہ کہتے ہیں
سہارا ڈھونڈنا کیسا جو لے لے نام منزل کا

کبھی ہے ناز فرمائی کبھی بے وجہ کی رنجش
کسی دن رنگ لائیگا یہ بڑھتا حوصلہ دل کا

اثرؔ کس کام کے ہم تھے زمانہ قدر کیا کرتا
برابر کیوں نہ ہو مٹنا کہ رہنا نقشِ باطل کا

مسلسل

سونی پڑی ہے بزمِ تماشا ترے بغیر
ویران ہے خیال کی دنیا ترے بغیر

امروز زندگی میں حلاوت نہیں رہی
بے کیف ہے فسانۂ فردا ترے بغیر

تیرا حریمِ خاص تھا جو دل اُسی پہ آج
ماتم سرا کا ہوتا ہے دھوکا ترے بغیر

رنگیں نوائیوں کا چمن زار تھا جو دل
ہُو مارتا ہوا ہے وہ صحرا ترے بغیر

حُسنِ نظر وہی ہے وہ حُسنِ بیاں کہاں
تیرے بغیر اے گلِ رعنا ترے بغیر

پرتو سے تیرے رُخ کے جو دل رشکِ مہر تھا
اب ہے وہ ڈوبتا ہوا تارا ترے بغیر

اک بہتی راگنی جو نسیم بہار تھی
وہ نوحہ بن گئی ہے سراپا ترے بغیر

قابل ہوئی ہے رحم کے اب میری بیکسی
دل ڈھونڈتا ہے غم کا سہارا ترے بغیر

گل دعوتِ نظارہ تو دیتے رہے بہت
میں نے نہ آنکھ بھر کے بھی دیکھا ترے بغیر

جس سے بھی ہمکلام ہوں تجھ سے ہوں ہمکلام
کیا کیا کیا ہے شوق نے رسوا ترے بغیر

صبحِ طرب ہے اور نہ وہ شامِ انبساط
افسردگی ہے اور دلِ شیدا ترے بغیر

آلودہ سرشک ہے دامانِ آرزو
ڈوبی ہوئی ہے نبضِ تمنا ترے بغیر

بیگانۂ نشاط ہے دورِ سبو و جام
ہے دل خراش خندۂ مینا ترے بغیر

اُلٹی ہوئی ہیں شیشۂ و ساغر کی ہچکیاں
اوپر کی سانس لیتی ہے صہبا ترے بغیر

خود اضطراب بسمل در خون تپیدہ ہے
اب ہے یہ اضطراب کا نقشا ترے بغیر

شائستۂ بیاں نہیں خود آ کے دیکھ لے
جو کچھ ہوا ہے حالِ اثر کا ترے بغیر

عافیت دشمن ہے تو اور آرزو بیگانہ ہم
آ ہم اب صلح کر لیں اے دل دیوانہ ہم

مے چھلک پڑتی ہے شیشے سے سبو سے جام سے
چوم لیتے ہیں جو مستی میں لبِ پیمانہ ہم

کیا خبر کس وقت آ نکلے ادھر وہ مستِ ناز
رات بھر رکھتے ہیں روشن دل کا خلوت خانہ ہم

ہم نشیں اب یہ کسی کی یاد کا انداز ہے
ہوش کے عالم میں بھی ہیں ہوش سے بیگانہ ہم

زیب و زینت بزمِ ہستی کی ہمارے دم سے ہے
تم ہو شعلہ شمع کا سوزِ دل پروانہ ہم

اشک امڈے اور بس قصہ وہیں پر ختم تھا
حال دل کہنے چلے تھے اُس سے بیتابانہ ہم

شب کی خاموشی میں سہم دل سے آتی ہے صدا ایک افسانہ ہے عالم، حاصلِ افسانہ ہم
نطق خود لذت پر اپنی وجد کرتا ہے اثر
طرزِ آتش میں غزل کہتے ہیں جب رندانہ ہم

منزل سے آشنا ہیں نہ جاذبِ رسا سے ہم پامالیوں کی راہ میں ہیں نقشِ پا سے ہم
کیونکر قرار آئے دلِ بے قرار کو کیونکر گلے ملائیں اثر کو دعا سے ہم
بیگانگی سی ہو گئی خود اپنے حال سے اتنے رہے ہیں دور کسی بیوفا سے ہم
ٹھکرائے جا رہے ہیں خود اپنے دیار میں اور اس لئے کہ بھٹکے نہ راہِ وفا سے ہم
سرمایۂ حیات لٹاتے پئے حیات مستانہ وار گزرے ہیں راہِ وفا سے ہم
مانندِ صبحِ گل کہ ہے آسودۂ بہار ہیں ہمکنار نکہتِ دیر آشنا سے ہم
گویا سرشتِ حُسن و محبت بدل گئی کیسی فضا میں آ گئے کیسی فضا سے ہم
ہر چند کچھ نہیں ہیں مگر پھر بھی کچھ تو ہیں عیبِ ستم فروشیٔ لبِ حسرت نوا سے ہم
وہ دن گئے کہ یہ بھی تھا غیرت کو ناقبول اب تم کو مانگتے ہیں دعا میں خدا سے ہم
لذت کشِ فغاں نہ ہوا ذوقِ غم اثر
مجبور ہو گئے دلِ ضبط آشنا سے، ہم

اہلِ ہوس سے ہوش کی منزلیں طے ہوئیں نہیں ورنہ وہ چشمِ مست کب میکدہ آفریں نہیں
راہ اُس آستانے کی تجھکو ملے تو کس طرح سجدۂ بندگی ترا بے خبرِ جبیں نہیں

نیم نگہ کا واسطہ دیکھ لے ایک بار پھر
جس کا سبب نہ کھل سکے ایسی خلش نہیں نہیں

ہائے وہ لذتیں جو ہیں عشق کے التہاب میں
اور یہ جانتے ہوئے زہر ہے، انگبیں نہیں

ایسے بھی لمحے گزرے ہیں حیرتیٔ جمال پر
جلوۂ نظر کے سامنے دل کو مگر یقیں نہیں

جب سے تری تلاش نے درسِ غمِ آگہی دیا
سیر وہاں کی ہے جہاں حُسن تو ہے حسیں نہیں

گریہ حریفِ شوق ہے شوق حریفِ آرزو
لیجئے دم تو کس جگہ منزلِ دل کہیں نہیں

شکوہ غلط گلہ غلط نالۂ نارسا غلط
درخورِ لطفِ آشنا سچ تو یہ ہے ہمیں نہیں

میری نماز اور ہے میرا مقام اور ہے
عشق کی اصطلاح میں سجدہ تو ہے جبیں نہیں

شبنمِ لالہ زار دیکھ صبح ستارہ بار دیکھ
حیف وہ اشک جو اثرؔ نازشِ آستیں نہیں

عشق کی گرمیٔ بازار کہاں سے لاؤں
یوسفِ دل کا خریدار کہاں سے لاؤں

سنتے ہی نغموں کی اک لہر رگوں میں دوڑے
میں تری شوخیٔ گفتار کہاں سے لاؤں

وہی شوریدہ سری ہے وہی ایذا طلبی
عشق میں جادۂ ہموار کہاں سے لاؤں

ہو گئیں آنکھوں سے وہ مست نگاہیں اوجھل
عشرتِ خانۂ خمار کہاں سے لاؤں

دل کی دھڑکن میں سنا کرتا تھا پیغام ترا
اب وہ ہنگامۂ بسیار کہاں سے لاؤں

اُس پہ آئینہ ہو کس طرح حقیقت دل کی
شوقِ منت کشِ اظہار کہاں سے لاؤں

معبدِ دل میں پرستارِ محبت ہوں اثرؔ
دوش کافر و دیندار کہاں سے لاؤں

آؤ آراستہ نغموں کا گلستاں کر دیں
یوں کہ خود بادِ بہاری کو غزلخواں کر دیں

اپنی زینت میں کرے حُسن کمی سی محسوس
آج وہ عشق کا پہلو بھی نمایاں کر دیں

دل کشی ہو وہی نوحے میں جو نغمے میں ہے
نوحے اور نغمے کو آہنگ میں یکساں کر دیں

دل ادھر اور اُدھر سارا زمانہ تڑپے
تپشِ آہنگیٔ شوق اتنی فراواں کر دیں

تم کہے جاؤ کہ ہے کفر ہمیں دھن یہ ہے
عشق کو نازشِ سرمایۂ ایماں کر دیں

گُل کو معلوم ہو کہتے ہیں مہکنا کس کو
نکہتِ اس زلفِ پریشاں کی پریشاں کر دیں

لبِ منصور "انا" جائے انا الحق دُہرائے
اور کچھ تیز اگر فتنۂ عرفاں کر دیں

دیکھیں فرزانگیٔ ہوش سمجھتی کیا ہے
اے جنوں آ تجھے پابندِ گریباں کر دیں

استواری جو ارادوں میں ہو مانندِ خلیل
آگ کے شعلوں کو گلزارِ بداماں کر دیں

ہم جو چاہیں تو خزاں سے ہوں بہاریں پیدا
خار کو زخمہ زنِ سازِ گلستاں کر دیں

جگمگا اُٹھے اثر جس سے شبِ تارِ حیات
ایسی اک شمع سرِ راہ فروزاں کر دیں

دامن ہے دریدہ نہ گریباں ہے دریدہ
وحشت ہی خود اب پہلوئے وحشت سے رمیدہ

جو حال تھا دل کا وہی حالت ہے جگر کی
صد پارہ بہم دوختہ و باز دریدہ

ہاں سچ ہے وفا حُسن کا شیوہ نہیں لیکن
مشتاق سے اتنے بھی نہیں رہتے کشیدہ

تو وہ گُلِ تازہ ہے گلستانِ جہاں میں
تکتی ہے جسے پیار سے خود صبحِ دمیدہ

جب آئی تری یاد اس انداز سے آئی
ساغر میں مئے ناب کہ ہو تند و رسیدہ

اُس بارگہ ناز سے کب دیکھئے پلٹے پیغامبر عشق، مرا رنگ پریدہ
کچھ دن سے یہ نقشہ ہے کہ ایک اک مژۂ تر دیتی ہے لہو مثل رگ تاک بریدہ

کچھ اور اثر حسن بت سادہ جبیں ہے
رہنے دو جو ہے عارض گل غازہ کشیدہ

ہر چند کلیجا پھنکتا ہے ساقی سے تقاضا کون کرے
اسے حد سے گزرتی تشنہ لبی یہ ننگ گوارا کون کرے

جس راز سے واقف کوئی نہیں اُس راز کو افشا کون کرے
خود حُسن اگر غماز نہ ہو تو عشق کا چرچا کون کرے

یک جلوہ و صد حیراں نظری شوریدہ سری پھر بے خبری
اس عشق تماشا دشمن کو مانوس تماشا کون کرے

جلتی ہے پلک تپتی ہے نظر اک آگ لگی ہے سینے میں
مشتاق سے اپنے تیرے سوا ایسے میں بھی پردا کون کرے

اب شوق بھڑکتا شعلہ ہے دیتی ہے جسے ہر سانس ہَوا
بیتابی سی بیتابی ہے اظہار تمنا کون کرے

اس رنگ رنگیلی دنیا کا ہر لمحہ سُنہری سپنا ہے
سپنا کہ ڈلکتا سونا ہے انجام کی پروا کون کرے

رنگین پر دل کے کچھ طائر یا خواب یہاں پرواز میں ہیں
تفسیر میں اُلجھا کون رہے تعبیر کا دعوےٰ کون کرے

جب حال یہ ہے بے مہری کا ہم ڈوبتے ہیں وہ ہنستے ہیں
ساحل کی تمنا ایک طرف ساحل کا نظارا کون کرے

جو کچھ بھی گزرتی ہے گزرے انجام وہ ہو جو ہونا ہے
جو آپ خریدا جائے اثرؔ اُس غم کا مداوا کون کرے

تیرے کشتوں کے منہ جب آئی ہے — خود اجل نے شکست کھائی ہے
آرزو کو جہاں بھی وصل ہوا — عاشقی پھر نہیں گدائی ہے
اب جو ہونٹوں پہ ہے تبسّم سا — پردہ دارِ غمِ جدائی ہے
ناز کیسا غرور ہے زیبا — دولتِ عشق ہاتھ آئی ہے
اے گرفتارِ عشرتِ فانی — موت ہستی کی رونمائی ہے
اک دلِ بے قرار و صد پارہ — عاشقوں کی یہی کمائی ہے
قہر تھا تیرا مسکرا دینا — میل کے بعد پھر لڑائی ہے
سننے والا کوئی نہیں ملتا — جب کہانی مرنے پہ آئی ہے

باتیں کرتے ہیں یوں اثرؔ جیسے
ان کی اس شوخ تک رسائی ہے

شکارِ بے اثری ہے دعائے نیم شبی — کہ ترک ہو نہ سکی دل سے خوئے غم طلبی
تری ہوس کے ہیں زاہد یہ گُل کھلائے ہوئے — کہاں بہشت کہاں دورِ بادۂ عنبی
نگاہ محرمِ اسرار ہو تو کیوں کر ہو — حقیقتوں پہ ہے چھایا غبارِ بے سببی

کبھی کبھی تو یہ تمیز ہو گئی مشکل
نظر کے سامنے تم ہو کہ ماہ نیم شبی

نہ دے فریب محبت کہ یاد ہیں اب تک
شکستِ دل پہ ترے خندہ ہائے زیر لبی

جگائے کون کہ حرماں کی پاسبانی میں
نصیب سو گئے زیر ردائے تیرہ شبی

نہ کم نگاہ ہے ساقی نہ تنگ ظرف ہیں رند
ہزار جرعۂ بادہ ہزار تشنہ لبی

نگار خانۂ عرفاں تھا دین جس کی جگہ
کئے ہیں وضع صنم خانہائے بوالعجبی

اثرؔ یہ راز نہ سمجھا ہزار دانا تھا
کہ اضطراب کی تحریک ہے سکوں طلبی

بہت حسین ہے مانا ستارۂ سحری
نہ تیرا ناز و کرشمہ نہ تیری عشوہ گری

شرابِ عشق بھری دل کے آبگینے میں
کمالِ شیشہ گری و کمالِ خوش نظری

فغاں تو لب پہ نہ آئی مگر سحر ہوتے
فسانۂ شبِ غم کہہ گئی مژہ کی تری

جہانِ ہوش کے سب مرحلے تمام ہوئے
نسیمِ شوق کے جھونکے ہیں اور بے خبری

نہیں جو زمزمہ زن سازِ دل تو کیا حاصل
فغانِ نیم شبی ہو کہ گریۂ سحری

دعا سے ہاتھ اٹھایا کہ جب اٹھائے ہاتھ
زباں پہ آنے لگے شکوہ ہائے بے اثری

معاف رکھئے مجھے اب التفات بیجا سے
کہ اس میں تیرے غمِ عشق کی ہو پردہ دری

وہ انکھڑیاں کہ چھلکتے ہوئے ہیں پیمانے
نہ جانے نیند ہے ان میں کہ ہے شراب بھری

یہ کہہ رہا تھا اثرؔ فلسفیٔ دیوانہ
جنوں جنوں ہی نہیں جب ہے قید جامہ دری

میرے خوابوں کو وہ پھولوں میں بسا دیتا ہے — پھر ہر اک خواب کو اک نغمہ بنا دیتا ہے
جس قدر درد بڑھے شوق بڑھا دیتا ہے — جو ہے شایانِ محبت وہ صلا دیتا ہے
ضبط اُس آن محبت میں مزا دیتا ہے — دل کی جب اُٹھتی ہوئی ہوک دبا دیتا ہے
شکوہ بے وجہ بھی کرتے ہیں محبت والے — روٹھ جانا کسی کافر کا مزا دیتا ہے
ضبط اور ضبط بھی اک شوق کے دیوانے کا — آبگینہ دلِ بسمل کو بنا دیتا ہے
تاکہ شکوہ نہ کرے کوئی تغافل کشتہ — شوخیٔ ناز کو تعلیم حیا دیتا ہے
عشق آغاز میں شورش ہے مگر آخر کار — درد کو درد کا مقصود بنا دیتا ہے
تابِ گلچینیٔ نظارہ کہاں سے لاؤں — وہ تو پردا رُخِ زیبا سے اُٹھا دیتا ہے
یوں تو دینے کو وہ کیا کیا نہیں دیتا لیکن — قسمت اُسکی ہے جسے ذوق رسا دیتا ہے

شب کے سناٹے میں محسوس یہ ہوتا ہی اثر
کوئی رہ رہ کے درِ دل پہ صدا دیتا ہے

اک رنگ کا طوفاں اُٹھا ہے ساقی کی نظر پڑ جانے سے
ہے جوش یہی جو مستی کا اُڑ جائے گی ہے پیمانے سے

پُرسش تو کہاں بھولے سے ادھر اُس شوخ نے اک دن دیکھا تھا
افسانے بنایا کرتا ہے دل اتنے سے اک فسانے سے

تم بیٹھے اجل کو روتے ہو اور شعلۂ ہستی پھونک گیا
سمجھو تو زباں شمع کبھی پوچھو تو سہی پروانے سے

امید کا دامن تھامے رہو مقصد کا حصول کبھی، دور نہیں
ہوتی ہے سحر کی نشو و نما راتوں کو اندھیرا چھانے سے

اب دل کی تڑپ اک نغمہ ہے کانوں میں جو گونجا کرتا ہے
کچھ خون تمنا ہونے سے کچھ نقش وفا مٹ جانے سے

آنکھیں خیرہ باتیں بہکی کچھ نشہ سا کچھ وحشت سی
آئے ہیں کہاں سے آج اثر دیوانے سے مستانے سے

وہ مست ناز ادھر آئے نہ آئے — جب اپنی ہی خبر آئے نہ آئے
سلامت دیدۂ خونابہ افشاں — بہار منتظر آئے نہ آئے
چمن تاراج ہے ویراں نشیمن — خدارا آنکھ بھر آئے نہ آئے
ق
جریدہ سوئے منزل گامزن ہو — بلا سے راہبر آئے نہ آئے
اٹھ اور گردش زمانے کی بدل دے — یہ دَور اے بے خبر آئے نہ آئے
یہی ہے وقت طرح مشرق نو — دوبارہ یہ سحر آئے نہ آئے

گداز دل ملا الحمد للہ
مجھے کوئی ہنر آئے نہ آئے

پستی نظر میں ہو نہ بلندی نظر میں ہے — خمیازۂ خمار تمنا نظر میں ہے
تعبیر ہے سکوں سے دل بے قرار میں — وہ موج اضطراب جو نبض شرر میں ہے
پھرتا ہوں اپنے ساتھ گلستاں لئے ہوئے — اک نو بہار ناز کا جلوہ نظر میں ہے

یہ کون تیز گام ادھر سے گزر گیا — منزل بھی مثلِ جادۂ منزل سفر میں ہے

فطرت پرست ہوں مجھے کیا میکشی سے کام — کیفِ ہزار بادہ طلوعِ سحر میں ہے

جاتا ہوں جس طرف لیے جاتا ہے جذبِ دل — جادہ نظر میں اور نہ منزل نظر میں ہے

جلتا ہو جیسے بن میں کہیں دور پر چراغ — اک داغ یادگارِ تمنا جگر میں ہے

کھلتا نہیں کہ قرب ہے کیا اور بُعد کیا — میری نظر سے دور وہ میری نظر میں ہے

خطروں سے کھیلنے میں جو عشرت ہے وہ اثر
بالیں پرستیوں میں نہ خوابِ سحر میں ہے

حیات اک موجِ بحرِ بیکراں معلوم ہوتی ہے — جبھی تو نامکمل داستاں معلوم ہوتی ہے

ادھر پیمانے چھلکیں اور ادھر ساغر ستاروں کے — ابھی تو رات اے ساقی جواں معلوم ہوتی ہے

یہ کیسا تفرقہ ڈالا نگاہِ فتنہ ساماں نے — تمنا سے تمنا بدگماں معلوم ہوتی ہے

بہار آئی اور ایسی رنگ میں ڈوبی ہوئی آئی — کہ موجِ بوئے گل بھی پرفشاں معلوم ہوتی ہے

معاذ اللہ وہ محرومیوں کی یاس انگیزی — محبت جب متاعِ رائگاں معلوم ہوتی ہے

کچھ اس سے کرے اندازہ مرے حالِ پریشاں کا — کہ پرسش تیری پرسش بھی گراں معلوم ہوتی ہے

فنا کہتے ہیں جس کو وہ نگاہِ ذوقِ بینا میں — صدائے بازگشتِ کن فکاں معلوم ہوتی ہے

بھری برسات میں ہمدم یہ لہراتی ہوئی بجلی — مری آنکھوں میں شاخِ آشیاں معلوم ہوتی ہے

نکال لایا ہے تو مجھکو کہاں اے عشقِ شوریدہ — کہ منزل بھی غبارِ کارواں معلوم ہوتی ہے

گیا وہ بھی جو تھا اک مشغلہ شبہائے ہجراں کا — کہ دل پر بند اب راہِ فغاں معلوم ہوتی ہے

اثرؔ سے دور دَورِ شادمانی ہے کہ سعی اُس کی
ابھی وابستۂ سود و زیاں معلوم ہوتی ہے

اگرچہ رہ گئی جو بات تھی سُنانے کی
بہت لطیف ہیں بے ربطیاں فسانے کی

تمیز ہی نہ رہی کیا بدی ہے کیا نیکی
بدل گئی ہے کچھ ایسی ہوا زمانے کی

جفا کے ساتھ ہی عذرِ جفا بھی ہنس ہنس کر
ستم ظریف کوئی حد ہو دل دُکھانے کی

کچل کے رُوح کو جتنا نکل گیا آگے
اُسی حساب سے پلٹی ہے مت زمانے کی

حیات اپنی ہے مابین دو عدم واقع
ملے کڑی سے کڑی کسطرح فسانے کی

ہزار حیف کہ صیاد نے اُجاڑ دیا
بہار دید کے قابل تھی آشیانے کی

اثرؔ ہیں اور درِ دیر کی گدائی ہے
سزا ملی ہے یہ اک بُت سے دل لگانے کی

سنہ ۱۹۴۶ء

کیا چمن کہاں کے گل کس کی خزاں بہار کیا
سب ہیں کرشمے ہوش کے ہوش کا اعتبار کیا

اس کی نگاہ لطف کا آہ سے کیوں دیا جواب
اب ہو وہ تجھ سے ملتفت اے دل بیقرار کیا

شوق نے چٹکیاں بھی لیں پھر بھی نظر نہ اٹھ سکی
عشق میں جبر کے سوا اور ہے اختیار کیا

گل کی شگفتگی نہ دیکھ راز شگفتگی سمجھ
تا کہ ہو تجھ پہ آئنہ کیا ہے خزاں بہار کیا

چند مٹی سی حسرتیں اپنے ہی غم میں سوگوار
تیرے غرور ناز کو یہ بھی ہے ناگوار کیا

نشۂ بے خمار ہے کہتے ہیں جس کو زندگی
تو نے مجھے پلا دیا بادۂ خوش گوار کیا

میرے نیاز عشق نے اپنی بلائیں آپ لیں
اس نے جو ناز سے کہا "تیرا ہے اعتبار کیا"

رنگ کے بدلے خون میں ڈوبی ہوئی کلی کلی
تیری مراد باغباں ایسی ہی تھی بہار کیا

پیک خیال بھی اثر جا کے پھرا نہ آج تک
پردۂ انتظار میں آپ ہے انتظار کیا

اک فقط میں ہی نہیں وہ بھی پشیماں ہوگا
بیکسی میں جو مرے حال کا پرساں ہوگا

ایک مرکز پہ سمٹ آئے نظام عالم
بے محبت کے ہوا ہے نہ یہ ساماں ہوگا

گرمیٔ شوق یہی ہے جو دمِ جلوہ گری　　خود نظارہ صنعت شعلہ پر افشاں ہو گا
بزم کی بزم سلگ اُٹھے گی یہ یاد رہے　　بے گناہوں کے لہو سے جو چراغاں ہو گا
جو ترے حُسن کے جوہر بھی نمایاں کر دے　　آئینہ تو وہ نہ ہو گا دل حیراں ہو گا
رنگ چہرے کا ذرا دیکھئے آئینے میں　　جایئے آپ سے کیا درد کا درماں ہو گا

دیکھیں کیا کہتے ہیں ابتک جو کہا کرتے تھے
طرزِ مومن میں اثرؔ خاک غزلخواں ہو گا

"ہوش میں اپنے رہو" ورد ہے دیوانے کا　　کچھ اثر ہو تو چلا آپ کے سمجھانے کا
نام پوچھے جو کوئی نام ترا لیتا ہے　　اب یہ انداز جنوں ہے ترے دیوانے کا
شیشہ و ساغر و مینا سے چھلکتا تھا مگر　　کوئی سمجھا نہیں کیا راز ہے میخانے کا
ہستی و مرگ سے تعبیر کیا ہے جس کو　　ناتمام ایک ورق ہے مرے افسانے کا
جب تک آنکھیں تری دیکھی نہ تھیں دیکھا ہی نہ تھا　　نام سنتے تھے چھلکتے ہوئے پیمانے کا
جل گیا خاک ہوا، خاک بھی برباد ہوئی　　جب کہیں نام چلا عشق میں پروانے کا
تیری ہی طرح کرن چاند کی خورشید کی ضو　　راستہ بھول گئی ہے مرے غم خانے کا

یہ سمجھ لو کہ ہوئی شعر کی تکمیل اثرؔ
رنگ کھپ جائے حقیقت میں جب افسانے کا

اثرؔ آنکھ اب تک خماری نہیں　　ترے بس کی پرہیزگاری نہیں
جگر کاوی و دل فگاری نہیں　　کچھ اب پہلی سی بے قراری نہیں

ہنسو خواہ روؤ مرو یا جیو
غم عشق سے رستگاری نہیں

تجھے کیا خبر عشق کیا چیز ہے
کبھی جیتی بازی تو ہاری نہیں

وہ صبر آزما ہے میں دل باختہ
کوئی شکل مطلب برآری نہیں

مئے یاس ہے جام امید میں
جبھی رنگ پر بادہ خواری نہیں

شکستوں کا احساس ہو اور دل
ابھی شیشے پر ضرب کاری نہیں

نہ ہو غم تو پھر عیش کا کیا مزا
نشاط ابد اعتباری نہیں

نہ اُس کی خطا ہے نہ میرا قصور
وفا یا جفا اختیاری نہیں

فلک پر ستارے مژہ پر سرشک
وہ راتیں وہ اختر شماری نہیں

اثر کیوں نہ بڑھ بڑھ کے باتیں کریں
کسی دشمنِ جاں سے یاری نہیں

نامرادی کے سوا اور کچھ اب یاد نہیں
زندگی اپنی بجز محنت برباد نہیں

دل کہ لذت کش محرومیٔ فریاد نہیں
یہ سمجھتا ہے تمہیں اب سر بیداد نہیں

تم پشیمان ستم مجھکو ستم یاد نہیں
عشق میں اس سے زیادہ کوئی افتاد نہیں

میری نظروں نے تجھے حُسن پہ مغرور کیا
اے مرے بھولنے والے تجھے کیا یاد نہیں

اب یہ شکوہ ہے محبت کے پرستاروں کو
جس قدر شوق ہو اتنی تری بیداد نہیں

گلشن دہر کا یہ رنگ دورنگی یارب
تیری ایجاد ہے کچھ میری تو ایجاد نہیں

شکوہ کرتے ہو زمانے کا اثر کیا تم کو
خود فراموشیٔ ارباب ہنر یاد نہیں

جو تم پہ حال دل اپنا نہ آشکار کریں — تمھیں بتاؤ کہ پھر کس کو رازدار کریں
بلامبالغہ "کشکول" اک مرتب ہو — خلاف وعدے اگر آپ کے شمار کریں
مجھے بہت ہی تصور کی گل بدامانی — جنھیں ہے تابِ نظر تیرا انتظار کریں
بلا سے منزل مقصود گم ہی ٹھہرے — وہ راہیں جو نہ ہوں پامال اختیار کریں
ترے جمال کی رنگینیوں میں گم ہو کر — ترے خیال سے آرائش بہار کریں
ابھی حیات کی زیبائشیں ہیں مدّنظر — بلا جو تجھ سے وہی تجھ پہ کیا نثار کریں

اثر سے کیوں ہو خفا رند کا یہ مصرع ہے
"جو بات مانو تو منت ہزار بار کریں"

نسیمِ سُبک بار سے کھیلتا ہوں — تری مست رفتار سے کھیلتا ہوں
کوئی نغمۂ نو ہویدا ہو شاید — نفس کے ہر اک تار سے کھیلتا ہوں
ابھی دور ہے منزل خود شناسی — ابھی اپنے پندار سے کھیلتا ہوں
ابھی جلوۂ وحدت نہیں نقش کثرت — ابھی حُسنِ تکرار سے کھیلتا ہوں
جن اشکوں میں شامل ہے خونِ تمنا — اُن اشکوں کے گلنار سے کھیلتا ہوں
بہت ملتی جلتی ہے خوبو کسی کی — ہر اک گُل ہر اک خار سے کھیلتا ہوں
جھلکتی ہے صُبحِ بہارِ گریباں — میں جیبِ چشمِ خونبار سے کھیلتا ہوں
اب اس حد پہ ہے مری مشکل پسندی — مضامین دشوار سے کھیلتا ہوں
اثر دادِ درماں سے بیگانہ ہو کر — فگار دلِ زار سے کھیلتا ہوں

یہ سنتے ہی وہ جانِ تمنا ہی راہ میں
سب دل کی دھڑکنیں سمٹ آئیں نگاہ میں

وارفتگیٔ شوق کے قربان جائیے
اپنی بلائیں لی ہیں ترے اشتباہ میں

مضراب عشق نے انھیں بیدار کر دیا
خوابیدہ تھے جو نغمے کسی کی نگاہ میں

وابستہ تیری یاد سے جب تک خیال ہے
اُٹھے قدم جدھر بھی ہیں تیری ہی راہ میں

قطرے سے بحر بحر سے قطرہ جدا نہ تھا
تفریق و جمع ایک ہوئے جب نگاہ میں

تجکو خبر بھی ہے کہ ترے غم کشوں نے آج
کارِ وفا تمام کیا ایک آہ میں

نظارہ ہے کہ موجِ نسیمِ سبک خرام
شاید پہنچ گیا ہوں تری جلوہ گاہ میں

آنکھوں ہی آنکھوں میں کوئی الزام دے گیا
جیسے کسر تھی کچھ مرے حالِ تباہ میں

دیکھا مآلِ عرضِ تمنا دلِ خراب
کتنا ہے فرق جب کی اور اب کی نگاہ میں

تو جانتا ہے خوب سزا دے کہ بخش دے
تلخی بھی ہے گناہ کی شامل گناہ میں

دیوانۂ خرام ہوں اک مستِ ناز کا
زنجیرِ موجِ گُل کی ہے پائے نگاہ میں

خطروں سے ڈھونڈتا تھا پناہ ایک دن آخر
خطروں سے کہہ دو آئیں اب اُسکی پناہ میں

کون کہتا ہے کوئی عہد کہ پیمان کرو
بات اگر پوچھ لو جھوٹوں بھی تو احسان کرو

ہنس کے کہتا ہے کہ مشکل تو سمجھ میں آئے
جب میں کہتا ہوں کہ مشکل مری آسان کرو

عشق کہتا ہے نہیں شوق یہ کہتا ہے کہ ہاں
بتقاضائے ستم اُس کو پشیمان کرو

وعدہ کرتے بھی نہیں آنکھ ملاتے بھی نہیں
ایسی غیرت ہے تو سچا کوئی پیمان کرو

عیش فردا میں مخل ہو نہ یاس کی یاد — ایک بیکس کو یہاں تک نہ پریشان کرو
زندگی اتنی سنوارو کہ دلہن بن جائے — بعد ازاں شاہد مقصود پہ قربان کرو
لڑکھڑائے جو قدم حسن کہے "بسم اللہ" — پہلے پیدا تو محبت میں یہ امکان کرو
عشق بیتاب تماشا و تماشا دشمن — اب تمہیں جلوہ گری کا کوئی سامان کرو

عاشقی کھیل نہیں آ گئے ہو مختار اثرؔ
غم کو مہمان کرو جان بھی ہلکان کرو

بدلتی نور میں کیونکر ہے ظلمت دیکھتے جاؤ — گناہوں کو نہ دیکھو اس کی رحمت دیکھتے جاؤ
ہجوم یاس و حرماں داغ سامانی پشیمانی — ابھی کیا کیا دکھاتی ہے محبت دیکھتے جاؤ
وفا بیزار تم ہو اور دل ہو عافیت دشمن — نہ ہونے پر ہو باہم ایک نسبت دیکھتے جاؤ
جگر میں آگ دل میں ٹیس رگ رگ میں خلش بھر دی — غلط انداز نظروں کی شرارت دیکھتے جاؤ
حصول مدعا میں جان دینا کھیل سمجھے ہیں — کفن بردوشی ارباب ہمت دیکھتے جاؤ
ابھی جو آرمیدہ ہیں شبستان تخیل میں — یہی خواب ایک دن ہونگے حقیقت دیکھتے جاؤ
کسے خلعت دیا ہے بیکسی نے نامرادی کا — سراپا کون ہے تصویر عبرت دیکھتے جاؤ

اثرؔ جب اس سے کچھ کہئے پلٹ کر وہ یہ کہتا ہے
"وہی بیکار کی پھر نکلی حجت دیکھتے جاؤ"

چلا آتا ہے اک مست شباب آہستہ آہستہ — دعائیں ہو رہی ہیں مستجاب آہستہ آہستہ
حیا کشتہ ہوں میں اٹھے نقاب آہستہ آہستہ — سکوں سے ہم بغل ہو اضطراب آہستہ آہستہ

شراب ناب دے لیکن ذرا رک رک کے جھک جھک کے ‏ نگاہ مست کر مست خراب آہستہ آہستہ
خود اپنے حسن کا پردا ہے نور سرمدی تیرا ‏ ہٹے جس طرح ہٹا اپنی نقاب آہستہ آہستہ
تسلی کی یہ باتیں ہیں کہ تڑپانے کی باتیں ہیں ‏ خموشی پھر تبسم پھر خطاب آہستہ آہستہ
بحمد اللہ شوخی سے ہوا شیر و شکر آخر ‏ کھلا موج تبسم میں حجاب آہستہ آہستہ
مجھے کیا نیند آئیگی کہ ہمدم میں نے دیکھی ہیں ‏ وہ آنکھیں بند ہوتے وقت خواب آہستہ آہستہ
شباب حسن کی گرمی میں ہے رنگ حیا شامل ‏ گل عارض سے کھنچتا ہے گلاب آہستہ آہستہ
محبت راہ کرتی ہے یوہیں محبوب کے دل میں ‏ کہ جیسے نشہ کرتی ہے شراب آہستہ آہستہ
کھلی جو آنکھ افق پر اک ستارا جھلملاتا تھا ‏ میں سمجھا تھا کہ جائے گا شباب آہستہ آہستہ

اثرؔ اس طرح میں مصرع ولیؔ کا تو سنا ہوگا
"خطاب آہستہ آہستہ جواب آہستہ آہستہ"

بدلتا ہے زمانے کا نظام آہستہ آہستہ ‏ سحر سے ہم بغل ہوتی ہے شام آہستہ آہستہ
ابھی تعمیر نو کا ذہن میں دھندلا سا خاکہ ہے ‏ عیاں ہوں گے در و دیوار و بام آہستہ آہستہ
مآل جبر و استبداد ظاہر ہو کے رہتا ہے ‏ لیا کرتی ہے فطرت انتقام آہستہ آہستہ
کوئی دیکھا کرے آخر کہاں تک خواب آزادی ‏ ہوئی جاتی ہے ذہنیت غلام آہستہ آہستہ
مجھے محسوس ہوتا ہے یہ تنہائی میں راتوں کی ‏ کوئی لیتا ہے جیسے میرا نام آہستہ آہستہ
فریب شوق بے رسوا کئے شاید نہ چھوڑے گا ‏ ابھی تھا کوئی مجھ سے ہمکلام آہستہ آہستہ
ہوائیں اب سکوں پرور ہیں گلزار محبت کی ‏ اثرؔ پختہ ہوا سودائے خام آہستہ آہستہ

بہم تجدید پیمانِ اخوت ہونیوالی ہے
یہ دنیا پھر بہشتِ آدمیت ہونے والی ہے

یہ کہتی ہے دھڑکتے دل سے فطرت کی ہم آہنگی
شبِ غم سے نمایاں صبحِ عشرت ہونے والی ہے

بدلتا جا رہا ہے متصل مرکز نگاہوں کا
روا داری فسانہ تھی حقیقت ہونے والی ہے

سلوک و مہر کی ہو گی یہاں میں گرم بازاری
متاعِ جبر و استبداد غارت ہونے والی ہے

جو اب تک ہو رہا تھا وہ فسوں تھا خود فریبی کا
عیاں دانشوروں پہ اپنی حالت ہونے والی ہے

نسیمِ جانفزا آئی نوید معتبر لے کر
امینِ رازِ ہستی پھر محبت ہونے والی ہے

ذرا آتا ہے دھیان اے شکیب آموز محرومی
کہ محرومی ہی افتادِ طبیعت ہونے والی ہے

نگاہِ بے محابا نے حیا کی آڑ کیوں ڈھونڈی
تو کیا میری وفا نذرِ ندامت ہونے والی ہے

اثر اس شدومد سے درگزر کی کیوں ثنا خوانی
کہیں دور اسکے دل سے کیوں کدورت ہونے والی ہے

کیا وہی تم ہو کہ جب مجھکو پریشاں دیکھتے
سوچ میں پڑ جاتے اور چینِ جبیں کے داماں دیکھتے

اب تڑپ اٹھتا ہے دل یا اس نگہ کے ساتھ ساتھ
جوشِ زن رگ رگ میں اک نغموں کا طوفاں دیکھتے

میں سمجھتا ہوں قیامت سے ہے تیری کیا مراد
عمر گزری ہے نگاہِ فتنہ ساماں دیکھتے

کچھ عجب اسلوب تھا اپنے جنوں کا ایکے سال
فصلِ گُل آخر ہوئی سوئے گریباں دیکھتے

اللہ اللہ خوش خرامی اک سراپا ناز کی
ہر قدم پر تازہ ترتیبِ گلستاں دیکھتے

یاد ہے تیرا لجا کر مسکرانا یاد ہے
خود نظارے کو نگارِ گل بداماں دیکھتے

کس قدر نازک نگر بھر پر تھا زخمِ جگر
دیکھنے والے وہی برگشتہ مژگاں دیکھتے

جاگ اٹھتا تھا نظارہ کروٹیں لیتا ہوا	مسکرا کر جب وہ رنگ چشم حیراں دیکھتے
ذرہ ذرہ یاس جہان راز مشتاق کشود	دیدنی تھا یوں جو رنگ دشت امکاں دیکھتے

کیا سبب ہے آبدیدہ ہم جو ہوتے ہو اثر
شبنم و گل میں سحر گہ ربط چسپاں دیکھتے

قطعہ ہم طرح غزل

یاد آیا میکدہ دل تھا گلفروش آرزو	آنکھ اٹھتی جس طرف پھولوں کی دکاں دیکھتے
کارفرما عشق تھا اور عشق میں یہ جذب تھا	اپنے کاشانے میں اک ہوش کو جہاں دیکھتے
آہ وہ رنگیں ادائیں اور اداؤں میں حجاب	گوہرستاں ہمکنار شبنمستاں دیکھتے
وہ جمی نظریں کہ دیکھیں سب کچھ اور دیکھیں نہ کچھ	دیکھنے کا دیکھنے سے ہٹ کے عنواں دیکھتے
جیسے کچھ کھویا ہوا بھولا ہوا سہما ہوا	شوق بڑھتا اور کافر کو پریشاں دیکھتے
وہ تو ٹھنڈی سانس بھر کر چونک پڑنا یک بیک	اور ہم ترک شکیبائی کا ساماں دیکھتے
دل میں لیکر چٹکیاں کہتیں یہ دل کی خواہشیں	کس قدر ہے مہربانی وہ راحت جاں دیکھتے
وہ مچلتی آرزوؤں کا تلاطم الاماں	وہ تقاضے پر تقاضا دیکھتے ہاں دیکھتے
چاک ہوتا ضبط کا پردا جنوں کے جوش میں	دست گستاخ تمنا میں وہ داماں دیکھتے
اور اس مدہوشی و وارفتگی کے درمیاں	ایک حرف مدعا ہونٹوں پہ لرزاں دیکھتے
ناگہاں کانوں میں آتی اک صدائے دورباش	عشق کو خود اپنی عصمت کا نگہباں دیکھتے

ٹوٹ جاتا جو ہوس کاری نے باندھا تھا طلسم
وہ ہمیں اور ہم انھیں محو ہوئے حیراں دیکھتے

ایک پر معنی خموشی بعد ازاں اُف بعد ازاں
وہ سر انگشت حنائی زیر دنداں دیکھتے

منھ چھپا لیتا کوئی ہاتھوں میں فرطِ شرم سے
اور ہم رعنائی طرز پشیماں دیکھتے

شاعری کتنی ہے اور کتنی حقیقت ہے اثرؔ
کاش اس تصویر کا یہ رُخ نمایاں دیکھتے

دنیائے رنگ و بو تہِ داماں لئے ہوئے
ذرہ ہے دستگاہ گلستاں لئے ہوئے

آتا ہے کھنچ کے اشکوں میں جو ہر بہار کا
کس کی شمیم ہے دل حیراں لئے ہوئے

وہ پیکرِ جمال ہے از فرق تا قدم
سرمایۂ بہار گلستاں لئے ہوئے

صبح امید و شام تمنا کی یادگار
سہمی سی اک خلش ہو رگ جاں لئے ہوئے

جوشِ جنوں میں ابکی چمن پر گماں ہے
آئی بہار حشر گریباں لئے ہوئے

دیوانہ ہے وہی کہ جو صحرا نورد ہو
پہلو میں اپنے دل سا بیاباں لئے ہوئے

"وہ ہاتھ کانپتا ہے جو کانپا نہ تھا کبھی"
اتنا کہوں گا نامۂ عصیاں لئے ہوئے

نظارہ جس کے شوق میں سرگشتہ ہے اثرؔ
حیرت سرا وہ جلوہ ہے تہ داماں ہوئے

تصور میں ہو تیرے کیف جب تک جان جاں باقی
مری فکر و نظر کی ہے بہار جاوداں باقی

کہا کرتا ہو کچھ مطلب مگر کچھ اور ہوتا ہے
رہے گی یہ وفا کب تک ہاں زیرِ زباں باقی

سمجھنے والے سمجھیں جو ہے بیگانہ وہ کیوں سمجھے
خموشی تو سنا اب زندگی کی داستاں باقی

شکستہ بال و پر جب ہو چکے تو فکر کیا ہمدم
کہ گلشن میں نہیں ہو یا ابھی ہے آشیاں باقی

جو ہوتا گوش دل سے سننے والا کوئی سن لیتا
ابھی تک ہے صدائے بازگشت رفتگاں باقی

نہ مجھکو باک پینے میں نہ ساقی کو پلانے میں
بقدر ذوق مستی ہے خمار جاوداں باقی

یہ ہیں کچھ منتشر ٹکڑے جنھیں تم سن نہیں سکتے
ابھی تو دردمندوں میں ہے ترتیب فغاں باقی

بہ رنگ بوئے گل آوارگی بھی حسن رکھتی ہے
کہ گرد کارواں میں ہے نشان کارواں باقی

اثر ہی اک نہیں اے اہل بینش لکھنؤ میں ہیں
کہیں بڑھ چڑھ کے اس سے شاعران خوش بیاں باقی

انداز سینہ چاکی وحشت نہ پوچھیے
دل تا جگر ہے ایک جراحت نہ پوچھیے

لازم ہے کچھ تو پاس مروت نہ پوچھیے
ہنس ہنس کے اک غریب کی حالت نہ پوچھیے

دامن قضا کا ہاتھ میں آ کے چھوٹ گیا
کیونکر بسر ہوئی شب فرقت نہ پوچھیے

بازار مصر یہ نہیں کنعان عشق ہے
یوسف نہیں ہر اشک کی قیمت نہ پوچھیے

جیسے افق پہ ڈوبتے تارے کی اک جھلک
کتنی تھی اپنے عیش کی فرصت نہ پوچھیے

نظریں بچا کے دیکھنے والے پکڑ گئے
میرا تبسم ان کی خجالت نہ پوچھیے

ہر لحظہ پیش چشم نئی کائنات ہے
عشق فسانہ ساز کی وسعت نہ پوچھیے

اکثر تو ان کی یاد پر ان کا گماں ہوا
پھر کیا تھی اضطراب کی صورت نہ پوچھیے

جب ناز اور نیاز کا مٹ جائے اختلاف
اس لمحۂ سکوت کی لذت نہ پوچھیے

امروز کے فراق میں فردا سے بے خبر
آسودگان حال کی غفلت نہ پوچھیے

آوارہ ہے شمیمِ گُل اپنے سراغ میں
کیا حُسن اور کیا ہے محبت نہ پوچھئیے

ناکامیوں نے عشق کی انجام کار آثر
کیا کیا بھری ہی درد میں لذت نہ پوچھیے

آپ کی یاد سے تسکین تو کیا ہوتی ہے
شورشِ تشنہ لبی اور سوا ہوتی ہے

اللہ اللہ تری مست خرامی کا سماں
جیسے بھیگی ہوئی ساون کی ہوا ہوتی ہے

جس میں پہلو کسی خواہش کہ ہوس کا نکلے
وہ محبت تو نہیں کوئی بلا ہوتی ہے

ختم ہوتی ہے جہاں شوق کی بیتابی
اُس جگہ راہ نما لغزشِ پا ہوتی ہے

کوئی چاہے بھی تڑپنا تو نہ تڑپا جائے
اُف وہ بیداد کہ تمہیدِ حیا ہوتی ہے

کس قدر کیف بھرا ہی تری انگڑائی میں
موجِ مئے شوق میں آغوش کشا ہوتی ہے

دل اگر صاف نہیں چھوڑ دے طاعت کا خیال
تیرگی نفس کی یوں اور سوا ہوتی ہے

وقت آتا ہے اک ایسا بھی محبت میں آثر
پُرسشِ دوست جب اندوہ فزا ہوتی ہے

خودی کو دے کے تمنائے بیخودی میں نے
بنا لیا ہے محبت کو زندگی میں نے

جو نغمے روح کی گہرائیوں میں سوتے تھے
بفیضِ عشق بھری اُن میں تھرتھری میں نے

خوشا وہ زیست کہ انسان کہہ سکے دمِ مرگ
جو میرے پاس امانت تھی سونپ دی میں نے

بڑے مزے سے گزرتی ہی زندگی جب سے
سمجھ لیا ہے ترے غم کو زندگی میں نے

جہانِ عشق میں کہرام ہو گیا برپا
ذرا جو درد میں محسوس کی کمی میں نے

کبھی تو اپنی اداؤں سے پوچھئے کہ انہیں — سکھائے کس نے یہ انداز دلبری؟ میں نے
اثرؔ اسی کو جو چاہو تو شاعری کہہ لو — زبانِ حُسن میں کی شرح عاشقی میں نے

آنکھیں دکھا رہا ہے ہر اک نقشِ پا مجھے — اے عشق تیری خیر کدھر لے چلا مجھے
ہو ہی رہے گا کچھ نہ کچھ انجامِ آرزو — تم سا جب ایک دشمنِ جاں مل گیا مجھے
پیشِ نظر وہی ہے جو پیشِ نظر نہیں — بے ربطیٔ نگاہ نے رسوا کیا مجھے
مل جائے گی وہیں سے رہِ منزلِ مراد — تیری طلب نے مجھ سے جہاں لے لیا مجھے
خوابِ خیال ہوگئی دنیائے آرزو — اُن رفعتوں پہ عشق نے پہنچا دیا مجھے
الزام دے رہا تھا دلِ مبتلا کو میں — الزام دے رہا ہے دلِ مبتلا مجھے
صدقہ نگاہِ مست کا پھر اس طرف نگاہ — درکار کیف سے بھی ہے کچھ ماورا مجھے
جس کے ہو زیر و بم میں تلاطم حیات کا — نغمہ سنا وہ مطربِ شورش نوا مجھے
ایسی بھی آئی منزلِ گم گشتگی اثرؔ — میں رہنما کو ڈھونڈتا تھا رہنما مجھے

تری شوخی کا آئینہ نظر معلوم ہوتی ہے — کہ ہر لحظہ باندازِ دگر معلوم ہوتی ہے
وہی اک رنگ میں ڈوبا ہوا کیفِ خمار آگیں — تری انگڑائی کا پرتو سحر معلوم ہوتی ہے
پڑی ہے چھوٹ جن جن پر تری برقِ تبسم کی — انہیں کرنوں کا مجموعہ سحر معلوم ہوتی ہے
تاسف تو اسی کا ہے وہی انجان بنتے ہیں — جنھیں کچھ دل نوازی میں نظر معلوم ہوتی ہے
نہ آئے کام آرائش میں جو تیرے شبستاں کی — انہیں پھولوں کا گلدستہ سحر معلوم ہوتی ہے
کلی کا مسکرانا ہو کہ گُل کا لہلہانا ہو — ترا ہی روپ تیری ہی نظر معلوم ہوتی ہے

۱۹۴۷ء

دل درد محبت سے جو بیگانہ رہے گا　ویرانہ نہ ہونے پہ بھی ویرانہ رہے گا
آباد خیالوں کا پری خانہ رہے گا　دل اپنے ہی انداز کا دیوانہ رہے گا
جلنا ہے مقدر میں وہ ہو قرب کہ دوری　پروانہ ہو جس حال میں پروانہ رہے گا
افسانہ وہ کہہ خون میں جو آگ لگا دے　کیا ورنہ جہاں میں ترا افسانہ رہے گا
بیہوش ہی جسے کر گئیں ساقی کی نگاہیں　وہ ہوش میں آنے پہ بھی مستانہ رہے گا
ہر شاخ جو انگڑائی تو گل ہو گئے جام ہی　ساقی جو یوہیں ہاتھ میں پیمانہ رہے گا
دریوزۂ ناموس کو ناموس نہ سمجھا　شہرہ ترا اے ہمتِ مردانہ رہے گا

اُس چشم فسوں ساز نے جو خواب دکھایا
کب تک آخر اس خواب کا افسانہ رہے گا

بجز اُن کے نہ سمجھے کوئی مطلب تھا یہی اپنا　نگاہ شوق چپکے سے فسانہ کہہ گئی اپنا
کرشمہ دیکھنا کافر کی دزدیدہ نگاہی کا　کہ رستا تک رہی ہی جب سے اب تک بیخودی اپنا
بلائیں ماہ تو لیتا ستارے گرد سر پھرتے　سمجھ لیتا جو راز آفرینش آدمی اپنا

کوئی بیدرد پھر مائل ہوا ہے دلنوازی پر
کہ ماتم کر نہ پائے بعد اس کے بیکسی اپنا

جبیں سائی بس اک حد تک ہی وجہ سرفرازی ہے
کچھ اس سے بھی بلند اب ہے مقام بندگی اپنا

کہاں وہ جامہ زیبی سادگی بھی حسن ہو جسمیں
لئے بیٹھی رہے آڑا دوپٹہ مالتی اپنا

اثر تم سے نہ یہ بھی ہو سکا ساقی کی محفل میں
کیا دل شیشہ و مینا و ساغر نے تہی اپنا

مسلسل

کس کی نگاہ شوق سے شرما رہے ہو تم
یہ کون مضطرب ہے کہ گھبرا رہے ہو تم

افسانۂ فراق نہ سننے کے واسطے
باتوں ہی باتوں میں کیسے بہلا رہے ہو تم

ہونٹوں پہ مضمحل سا تبسم ہے آنکھ نم
اور اُس پہ پھر اپنی قسم کھا رہے ہو تم

چہرہ اُداس اداس ہے تیور بجھے بجھے
منھ پھیر پھیر کر کسے سمجھا رہے ہو تم

منظور دلدہی ہے کس آشفتہ حال کی
دے دے کے بل جو زلف کو بل کھا رہے ہو تم

اس التفات ناز کے قربان جائیے
آئین سب وفا کے بجا لا رہے ہو تم

تاراج کر رہی ہیں جو خرمن شکیب کا
وہ بجلیاں نگاہ سے برسا رہے ہو تم

رعنائی شباب کا اللہ رے فروغ
رنگینیٔ خیال بنے جا رہے ہو تم

آہنگ میں اب ایک سے ہیں کیا رنج کیا خوشی
کچھ ایسے پھول نغموں کے بکھرا رہے ہو تم

ہر خواب ہمکنار حقیقت سے ہو گیا
ہر منظر حیات پہ یوں چھا رہے ہو تم

کہنا صبا گزر جو ہو سوئے دیار دوست اک خستہ جاں کو یاد بہت آ رہے ہو تم

کس کے خیال سے تھے اثرؔ ہمکلام ابھی

کیوں ٹالتے ہو کیا ہے جو شرما رہے ہو تم

جو بات نہ تھی کہنے کی اُس سے وہ کہی ہے یہ اچھی عداوت دل بیتاب نے کی ہے

حیرت گری شوق بھی ہے طرفہ تماشا آئینہ مقابل ہے نظر کھوئی ہوئی ہے

شوریدہ سری دیکھئے کیا اور دکھائے تیری ہی طرح یاد تری روٹھ گئی ہے

غمزے سے کبھی اُس نے ادھر دیکھ لیا تھا اُس دن سے تمناؤں میں اک لوٹ پڑی ہے

جیسے کوئی چٹکی سے مسلتا ہے کلیجا مُرلی کی وہ دُھن پچھلے پہر میں نے سُنی ہے

امرت بھری آنکھوں میں مدھر آنکھ کی پتلی رادھا ہو کہ گاگر لئے پنگھٹ پہ کھڑی ہے

الفت کا تو کیا ذکر وہ آیا ہے زمانہ آپس کی مدارات بھی افسانہ ہوئی ہے

وا شوق میں کب تک رہے آغوشِ تمنا

اے جانِ اثرؔ آنے میں کیا دیر بدی ہے

تری بزم سے جو اُٹھے یونہیں بار بار آئے کبھی عذر خواہ آئے کبھی شرمسار آئے

ترے وعدے میں ستمگر وہ غضب کی دلکشی ہے کہ ہزار دل نہ مانے مگر اعتبار آئے

وہ ہلاک شوق جو ہو فقط اک نگہ کا مجرم تری کج ادائیوں پر اُسے کیوں نہ پیار آئے

یہ طلسم محبت کی عجیب رسم دیکھی وہی جیتے دل کی بازی کہ جو دل کو ہار آئے

فقط اک وہیں نہیں ہوں جسے شوق اسقدر ہو تری آرزو میں گل بھی ہمہ تن کنار آئے

دل راحت آرزو کو خلش آشنائے غم کر
یہی ایک شکل اثر ہے کہ تجھے قرار آئے

بہکی بہکی ہے چال قاتل کی — کہہ گئی کیا نگاہ بسمل کی
اب ہے یہ رنگ بیقراری کا — جیسے حالت سنبھل گئی دل کی
جس کی رونق ہو ترے جلووں سے — دل نے آراستہ وہ محفل کی
کس سے کہئے جو کہئے کیا کہئے — بات وہ آپڑی ہے مشکل کی
بحر کا راز خاک سمجھے گا — جس کے سر میں ہوا ہو ساحل کی
ابکی پہلے جنوں سے کانوں میں — آرہی ہے صدا سلاسل کی
ہم جو منزل کو ڈھونڈتے پہنچے — شکل بدلی ہوئی تھی منزل کی

ہر شکست اک بنائے تازہ ہے
طرفہ تعمیر ہے اثر دل کی

حجاب میں جو کشش ہے حجاب کیا جانے — یہ بات پردے کی اُن کا شباب کیا جانے
کبھی یہ شبہ کبھی وہ گمان ہوتا ہے — اُن انکھڑیوں میں ہے نشہ کو خواب کیا جانے
تری نگاہ نے چھیڑا انھیں ہو جس دل کو — وہ لذت ستم اضطراب کیا جانے
خطا معاف علامت ہے بات ہونے کی — ہر اک سوال کا جب ہے جواب "کیا جانے"
جو خواب ناز سے تیوری چڑھائے اٹھا ہو — کسی غریب کا حال خراب کیا جانے
نظر کے سامنے انجام خود نمائی ہے — بجز شکست غرور حباب کیا جانے

اگرچہ روح میں اور جسم میں علاقہ ہے　　کتاب میں جو ہے لوح کتاب کیا جانے
جو درد دل نے کمی کی جگر میں ٹیس اٹھی　　محبت اس کے سوا انقلاب کیا جانے
نہیں ہے محرم شوخی تری نگاہ اثر
کسی کا جلوۂ رنگیں نقاب کیا جانے

نگاہیں اور منظر اور صورت اور ہو جاتی　　جو تم آتے مریض غم کی حالت اور ہو جاتی
سلوک مہر بھی ہوتا جو شیوہ حسن والوں کا　　جہان عشق و الفت کی حکایت اور ہو جاتی
محبت خود صلہ اپنا ہی لیکن پھر بھی اتنا ہی　　جو ہوتا کوئی پرساں تھوڑی راحت اور ہو جاتی
خموشی پر تو اسکی سرگرانی کا یہ عالم ہے　　نکلتی بات اگر منھ سے قیامت اور ہو جاتی
نیاز عشق ناز حسن سے نا آشنا ہوتا　　اگر تم باوفا ہوتے مصیبت اور ہو جاتی
نہ آیا ذوقِ غم کو بے نیاز آرزو ہونا　　یہ دنیا اور دنیا کی حقیقت اور ہو جاتی
نہ سمجھے راز گلشن کا اسیر رنگ و بو ہو کر
اثر اشعار میں پیدا لطافت اور ہو جاتی

بہار ہے ترے عارض سے لو لگائے ہوئے　　چراغ لالہ و گل کے ہیں جھلملائے ہوئے
ترا خیال بھی تیری ہی طرح آتا ہے　　ہزار چشمک برق و شرر چھپائے ہوئے
لہو کو پگھلی ہوئی آگ کیا بنائیں گے　　جو نغمے آنچ میں دل کی نہیں تپائے ہوئے
ذرا چلے چلو دم بھر کو دن بہت بیتے　　بہار صبح چمن کو دلھن بنائے ہوئے
قدیم سے ہے یہی رسم و راہ ملک وفا　　کہ آزمائے گئے جو تھے آزمائے ہوئے

ڈھٹائی دیکھی تجھی سے اڑاتے ہیں آنکھیں — ستارے آنکھوں کی تیری جھپک چرائے ہوئے
حیائے حسن میں حسن حیا اضافہ کر — نظر کے سامنے آجا نظر جھکائے ہوئے
جو منتظر تھے کسی کے وہ سو گئے آخر — سسکتی آرزوؤں کو گلے لگائے ہوئے
اب اس کے بعد گلہ کس سے کیجئے کس کا — سمجھتے تھے جنھیں اپنا وہی پرائے ہوئے
ہم اپنے حال پریشاں پہ مسکرائے تھے — زمانہ ہو گیا یوں بھی تو مسکرائے ہوئے
ہمیشہ کیف سے خالی رہیں گے وہ نغمے — جو تیری نکہت خوش میں نہیں بسائے ہوئے

اثر سناتی ہیں اب دل کی دھڑکنیں شب کو
فسانے اس نگہ مست کے سنائے ہوئے

یہ دیکھنے کی خوشی عیش رائگاں نہ بنے — نوائے ساز طرب زخمۂ فغاں نہ بنے
کرم کہوں کہ ستم دے کے اذن نظارہ — یہ حکم ہے کہ نگہ دل کی ترجماں نہ بنے
نیا چمن ہے نیا باغباں نئی بندش — کہ اب سے کوئی بلندی پہ آشیاں نہ بنے
خطا معاف صدا دور سے سنا نہ کیا — جو کارواں میں نہیں میر کارواں نہ بنے
بہار جوشئ گلہائے آرزو معلوم — نگاہ عصمت دل کی جو پاسباں نہ بنے
کہے یہ کون جو کہہ دے تو اک قیامت ہو — کہ مہرباں جو نہیں ہو وہ مہرباں نہ بنے
بہار ختم ہوئی ہم یہ سوچتے ہی رہے — کہاں چمن میں نشیمن بنے کہاں نہ بنے

نتیجہ دیکھ لیا پہلے سوچنا تھا اثر
گماں ہے سود کا جس پہ وہی زیاں نہ بنے

۱۹۴۶ء

دل میں جو سوز ہے وہ شمع فروزاں میں نہیں
خون صد شعلۂ تپاں تار رگ جاں میں نہیں

یاد سے تیری دل زار بہل جاتا تھا
اب وہ دھندلی سی کرن بھی شب ہجراں میں نہیں

خواب جو دیکھے گئے اب نہیں دیکھے جاتے
برہمی پہلی سی اُس زلف پریشاں میں نہیں

رنگ و نکہت سے ہے گویا چمنستاں خالی
پھول اشکوں کے اگر دامن عصیاں میں نہیں

کروٹیں کتنی ہی تہذیب نے بدلیں لیکن
درد انسانیت ابتک دل انساں میں نہیں

سُن لیا ہم نے بھی اک بزم میں چرچا تھا اثرؔ
کام کی بات کوئی آپ کے دیواں میں نہیں

اُس آستاں کی راہ نہ پائیں تو کیا کریں
سجدوں سے رہگزر نہ سجائیں تو کیا کریں

تیری ادائیں دل کو لُبھائیں تو کیا کریں
آنکھیں نہ مانیں دیکھے ہی جائیں تو کیا کریں

ہاں وہ ستم شعار ہے پیماں شکن بھی ہے
پھر بھی جو نکلیں دل سے دعائیں تو کیا کریں

مانا کہ آنسوؤں کا ہے پینا ہی مصلحت
آنسو جو پھر بھی اُمڈے ہی آئیں تو کیا کریں

کہنا نہ چاہیئے تھا جو اُس سے وہی کہا
جب تہ نہ اُسکی بات کی پائیں تو کیا کریں

وہ شوخیاں کہ جن کو حیا سے ہے ساز باز
بیتابیاں جو دل کو سکھائیں تو کیا کریں

خون ہزار حسرت و ارماں کے باوجود
اُسکی نظر میں ہم نہ سمائیں تو کیا کریں

تسلیم ہے کہ شیوۂ تسلیم یہ نہیں
شکوے زباں پہ خود بخود آئیں تو کیا کریں

غنچے چٹک چٹک کے جو فصل بہار میں
بھولے فسانے یاد دلائیں تو کیا کریں

طعنوں کا اُسکے جب کوئی بن پڑے جواب
مرزا اثرؔ جو سر نہ جھکائیں تو کیا کریں

نہ تم بدلے نہ دل بدلا نہ رنگ آسماں بدلا
نہ جانے کیوں نظر آتا ہی پھر سارا جہاں بدلا

گلوں کو سرگراں دیکھا تو اندازِ فغاں بدلا
مگر اُس پر بھی یا قسمت مزاج باغباں بدلا

نہ سوچا کوئی کیا کیا گُل کھلیں گے اسکے پردے میں
چمن سے جب چمن اور آشیاں سے آشیاں بدلا

ابھی تک شوق میں ساحل کے موجیں سر پٹکتی ہیں
نہ یہ بدلیں نہ اندازِ محیطِ بیکراں بدلا

ارے عرضِ تمنا کا کوئی پہلو نکلتا تھا
جبھی تو مسکرا کر شوخ نے طرزِ بیاں بدلا

نظر آتی نہیں اب منزلِ مقصود کوسوں تک
یہ کس نے کاروانِ شوق کا سنگِ نشاں بدلا

فقط اپنی سمجھ کا پھیر ہے ورنہ یہی دیکھا
زیاں بھی سود تھا جب مرکزِ سود و زیاں بدلا

صبا جو حال دیکھا ہے چمن والوں سے کہہ دینا
بہار آئی مگر ہم نے نہ ملبوسِ خزاں بدلا

توقعِ دلنوازی کی اثرؔ اور ایسے پُرفن سے
جو ہو کر بحث میں عاجز ڈھٹائی سے زباں بدلا

بدلیں وہ لاکھ بار زباں کچھ نہ پوچھئے
ہاں میں ملائے جائیے ہاں کچھ نہ پوچھئے

نظارہ تھا بساطِ گل و دامنِ بہار
رنگیں اداؤں کا سماں کچھ نہ پوچھیے

اللہ رے ذکرِ غیر کی ریشہ دوانیاں
پہنچی کہاں سے بات کہاں کچھ نہ پوچھیے

ذکرِ وفا جو چھیڑیے کہتا ہے بے وفا
کتنی سُبک ہے وضعِ جہاں کچھ نہ پوچھیے

یہ عشق وہ بلا ہے کہ اس بزمِ ناز میں
بنتی ہے خامشی بھی زباں کچھ نہ پوچھیے

جب دردِ دل کسی کو سنانے چلے ہیں ہم
لب پر مچل گئی ہے فغاں کچھ نہ پوچھیے

یوں جلوہ گر ہے دل میں خیالِ جمالِ دوست
جیسے سحر ستارہ نشاں کچھ نہ پوچھیے

میخانہ مست و ساقی و مینا و جام مست
جوشِ نشاطِ بادہ کشاں کچھ نہ پوچھیے

ہر چند اُس کو منفعلِ جور کر دیا
دل پر جو گزری بعد ازاں کچھ نہ پوچھیے

وہ اس کا آنکھ بھر کے ادھر دیکھنا اثرؔ
وہ رخصتِ شکیب و تواں کچھ نہ پوچھیے

دردِ محبت خونِ تمنا تجھ میں ملا کر دیکھیں گے
رنگ میں ڈوبا پھر یہ فسانہ اُن کو سنا کر دیکھیں گے

یوں نہیں آتے یہ تو سن کر آئیں گے آ کر دیکھیں گے
اُن سے الگ اب اُن کی محبت دل میں بسا کر دیکھیں گے

گردِ بیاباں تہ سے ہی خالی کچھ بھی نہیں شور انگیزی
کوچے کی تیرے چٹکی بھر اب خاک ملا کر دیکھیں گے

لاکھ ہو جذبہ تیہا آئے تیوری چڑھے کیا ہوتا ہے
آنکھ ملا کر دیکھنے والے آنکھ بچا کر دیکھیں گے

صبر کہاں تک جبر کہاں تک تیری نگاہیں اُٹھ ہی گئیں
سخت ہے برہم۔ آگ بگولا۔ پھر بھی منا کر دیکھیں گے

قید قفس سے بعد رہائی غم جو کریں آزادی کا
سر پھرے ایسے اپنا گلشن خاک سجا کر دیکھیں گے

ہوش کے بندے سمجھیں گے کیا غفلت ہے کیا ہشیاری
عقل کے بدلے جس دن دل کی جوت جگا کر دیکھیں گے

کس سے کہئے اور کیا کہئے سُننے والا کوئی نہیں
کچھ گھُٹ گھُٹ کر دیکھ لیا کچھ شور مچا کر دیکھیں گے

رشکِ محبت وقتِ نظارہ یہ بھی گوارا کرتا نہیں
طے یہ کیا ہے تم سے بھی تم کو اب سے چھپا کر دیکھیں گے

بات یہ کل کی ہی کہ اشہرؔ گھر پھونک تماشا دیکھا تھا
اب یہ تماشا گھی کے چراغ بھی گھر میں جلا کر دیکھیں گے

تبدیلِ بحر و ذو قافیتین

اب ذوقِ تپش کو مستی کا پیمانہ بنا کر دیکھیں گے
ہے شوق کا حاصل تشنہ لبی میخانہ لٹا کر دیکھیں گے

ہم توبہ تو کرتے ہیں واعظ لیکن یہ جتائے دیتے ہیں
جب یاد وہ آنکھیں آئیں گی پیمانہ اُٹھا کر دیکھیں گے

جینا بھی انھیں کا جینا ہے مرنا بھی انہیں کا مرنا ہے
جو شمع حقیقت کا دل کو پروانہ بنا کر دیکھیں گے

شاید ہو توجہ اپنی طرف اس طور سے صاحب محفل کی
پوچھے گا جو کوئی کون ہو تم بیگانہ بتا کر دیکھیں گے

پھر خواب جو دیکھے جائیں گے تعبیر بنیں گے مستی کی
جب تیرے تصور سے دل کا کاشانہ سجا کر دیکھیں گے

امید جو تم سے رکھتے ہیں دلداری کی غمخواری کی
کیا کیا نہ گنوا کر دیکھ چکے کیا کیا نہ گنوا کر دیکھیں گے

پھولوں کی کہانی خود پھولوں کی زبانی اس پردے میں اثر
آج ان کی اداؤں کا اُن کو افسانہ سُنا کر دیکھیں گے

تمنا تھی کہ ان سے دردِ دل کی داستاں کہتے
وہ سننے آئے ہیں تو لڑکھڑاتی ہے زباں کہتے

نہ دیکھا حیف تم نے وہ دلِ پُر داغ کا عالم
وگرنہ بے تحاشا پھول والوں کی دکاں کہتے

نیازِ عشق تھا جب تک حریفِ نازِ محبوبی
وہ ہم سے سرگراں ہوتے ہم اُن کو بدگماں کہتے

خدا کے واسطے انصاف کرائے روٹھنے والے
نہ کہتے سرگزشت اپنی اگر تجھ سے کہاں کہتے

صبا انگڑائیاں لیتی فضا سرشار ہو جاتی
چمن میں جب گلوں سے ہم تمہاری داستاں کہتے

غریب ایک صبر تھا مارا پڑا بے کار حجت میں
جسے میں جور کہتا وہ وفا کا امتحاں کہتے

بہانہ مل نہ جائے بجلیوں کو ٹوٹ پڑنے کا
کلیجا کانپتا ہے آشیاں کو آشیاں کہتے

اثر جو بات کرتے آہ کرتے ہیں وہی تو ہیں
غمِ دل بھی برائے لذتِ کامِ دہاں کہتے

کسی نے حال جب پوچھا تو یہ حالت ہوئی اپنی — نظر بھی جھک گئی اپنی زباں بھی رک گئی اپنی
جبین سجدہ میں کونین کی وسعت سما جائے — اگر آزاد ہو قیدِ خودی سے بندگی اپنی
وہی منزل ہے عرفاں کی وہی معراج انساں کی — جہاں مقصود بن جائے خود اپنا زندگی اپنی
نہ کچھ کہنا نہ کچھ سننا فقط منہ تکتے رہ جانا — پھر اسکے بعد پچھتانا کہ حسرت کہہ نہ دی اپنی
ہر اک انجم فلک سے چشمِ حیراں کا تماشائی — نچھاور کر رہا ہے چاند کس پر چاندنی اپنی
فقط اک نیم گفتہ حرف کافی تھا تسلی کو — مگر تم نے سپردِ شرم کر دی دلدہی اپنی
کہیں تو ہم کہیں کیونکر سنیں تو وہ سنیں کیونکر — اُدھر خود بینیاں اُنکی اُدھر بیچارگی اپنی

بفیض عشق آخر وہ مقام آگہی آیا　　جہاں محسوس ہوتی ہے ہر اک شے میں کمی اپنی

جنھیں ساحل کی حسرت ہے انھیں ساحل مبارک ہو
بغل پروردۂ طوفان اثرؔ ہے زندگی اپنی

نہ دیکھنے کی طرح ہم نے زندگی دیکھی　　چراغ بجھنے لگا جب تو روشنی دیکھی
کہا یہ کس نے کہ ہستی میں نیستی دیکھی　　نئے مقام نئی شان زندگی دیکھی
مآل دید بھی ہے انتظار کیا کہئے　　کہ پھر نہ آپ میں آتے ہوئے خودی دیکھی
کسی کی یاد نے کیا کیا ملائمتیں کی ہیں　　کبھی جو درد محبت میں کچھ کمی دیکھی
تجلیات کا پردا الٹ کے دیکھ یہ کیا　　کہ عکس مہر سے ذروں میں روشنی دیکھی
نہ اب ہے لب پہ تبسم نہ آنکھ میں شوخی　　یہ کس غریب کے دل کی شکستگی دیکھی
ہر ایک ذرے کے سینے میں دل دھڑک اٹھا　　نیاز عشق کی شان سپردگی دیکھی
حیا بھی کیف بھی غصہ بھی ہے ان آنکھوں میں　　شراب شعلہ میں شبنم گھلی ملی دیکھی

نظر سے گر گئی صبح چمن کی گل پوشی
اثرؔ نے اس لب لعلیں پہ جب ہنسی دیکھی

ہزار پردہ دل میں وہ جلوہ آشکار تو ہے　　نظر کے سامنے آئینۂ بہار تو ہے
یہی بہت ہے شب وعدہ جاگنے والے　　کہ دست شوق میں دامان انتظار تو ہے
نشان منزل گم گشتگاں بتانے کو　　صبا کی راہ میں آوارہ کچھ غبار تو ہے
یہ التفات کہ جس میں ذرا خلوص نہیں　　جو پوچھتے ہو تو کہتا ہوں ناگوار تو ہے

یہ تیرا طرزِ پشیماں یہ تیرا عذرِ ستم — نہیں بھی ہے جو محبت گناہگار تو ہے

نہ آئے حرفِ تمنا زبان پر لیکن
اثرؔ نگاہِ کرم کا امیدوار تو ہے

یہ تو نہیں کہ حسرتِ حاصل نہیں رہی — کاہش بقدرِ حوصلۂ دل نہیں رہی
ظاہر ہوا کہ عشق ہی لیلائے حُسن تھا — جب چشمِ شوق پردۂ محمل نہیں رہی
آرائشِ مژہ کے لئے کچھ تو چاہیئے — کیا اک لہو کی بوند بھی اے دل نہیں رہی
اک رہ نوردِ شوق کا اللہ رے اضطراب — جادہ نہیں رہا کبھی منزل نہیں رہی
یا حد سے بڑھ گئی ہیں مری سرگرانیاں — یا گُل میں بوئے خوش تری شامل نہیں رہا
اچھا ہے ڈوب جائے سفینہ حیات کا — امیدِ آرزوؤں کی ساحل نہیں رہی
پینا نہ پینا ایک ہے زاہد خطا معاف — نیت جب اعتبار کے قابل نہیں رہی
دل برقرار ہمتِ دل برقرار ہے — مشکل یہ آپڑی ہے کہ مشکل نہیں رہی
اب ناخدا کے ناز اٹھائے نہ جائیںگے — جس تشنگی کا نام تھا ساحل نہیں رہی

محفل وہی ہے صاحبِ محفل وہی اثرؔ
کیا ہے جواب وہ گرمیٔ محفل نہیں رہی

یہ وقت وہ نہیں کہ نشیمن بچائیے — بازی لگا کے جان کی گلشن بچائیے
بھڑکی ہوئی آگ فساد و عناد کی — پھنکنے کو آبرو کا ہے خرمن بچائیے
دل بجھ گیا تو جانیئے اندھیر ہو گیا — اک شمع آندھیوں میں ہے روشن بچائیے

کانٹوں پہ منحصر نہیں پھولوں سے بھی یہاں
ہے شرط احتیاط کہ دامن بچائیے

کیا میں تری نگاہ کو پہچانتا نہیں
دل کیوں نہ تجھ سے جان کے دشمن بچائیے

ہر چند آرزوؤں کا مدفن ہو دل نہیں
پامالیوں سے پھر بھی یہ مدفن بچائیے

جب پاک صاف روح کا شعلہ نہیں اثر
کیوں فکر ہے کہ جسم کا ایندھن بچائیے

زندگی کو زندگی پر ناز ہونا چاہیئے
راز کو خود راز کا غماز ہونا چاہیئے

دل کی ہر جنبش نوائے راز ہونا چاہیئے
اس کے پردے میں تری آواز ہونا چاہیئے

پھول کھلتے ہی رہیں نغمے برستے ہی رہیں
زندگی کی اس طرح پرواز ہونا چاہیئے

ہمت مردانہ کہتی ہے کہ پس از ہر شکست
پھر نئے سرے سے نیا آغاز ہونا چاہیئے

طائر جاں کتنے ہی گلشن ترے مشتاق ہیں
بازوؤں میں طاقت پرواز ہونا چاہیئے

خیر مقدم کو ہر اک فتنے کے میں تیار ہوں
تیرے قامت کا مگر انداز ہونا چاہیئے

میں بتاؤں مجھ کو تڑپانا اگر منظور ہے
دلنوازی بھی شریک ناز ہونا چاہیئے

بیکسی اے بیکسی آہ زیر آواز دے
کوئی تو شام الم دمساز ہونا چاہیئے

حال سے لیتے ہیں اہل ہوش مستقبل کی فال
عشرت ماضی نظر انداز ہونا چاہیئے

دھن کے پکے آگ کا دریا پڑے تو جھیل جائیں
آپ کو ہم سر پھروں پر ناز ہونا چاہیئے

مرنے کو تیار رہنا ہی نہیں کافی اثر
مثل بوئے گل شبک پرواز ہونا چاہیئے

گلہ غلط کہ وہ بت مہرباں نہیں ہوتا ہمیں سے حال جب اپنا بیاں نہیں ہوتا
ستم کے ساتھ ہی بڑھتی ہے آرزوئے ستم بقدرِ ذوق کبھی امتحاں نہیں ہوتا
الم نصیب نہ مجھ سا بھی ہو زمانے میں ترے کرم سے بھی دل شادماں نہیں ہوتا
غیورِ عشق ادھر حُسن ہے ادھر مغرور بہم ہے ربط مگر کیا عیاں نہیں ہوتا
زمانہ ساز کی عیاریاں خدا کی پناہ جفا ہے یوں کہ جفا کا گماں نہیں ہوتا

خودی کا پردہ جب اُٹھا ہو درمیاں سے اثر
تو دور دور تک اپنا نشاں نہیں ہوتا

جس دل پہ تھا گماں کہ ویرانہ ہو گیا آتے ہی تیری یاد پری خانہ ہو گیا
سچ تو یہ ہے کہ جتنے بھی تم نے کئے ستم رنگین اور عشق کا افسانہ ہو گیا
اک شعلہ پرفشاں ہے کہ اک برق ہے تپاں وہ دل جو تیرے حُسن کا پروانہ ہو گیا
اکثر یہ اتفاق ہوا انتظار میں پیشِ نگاہ جلوۂ جانانہ ہو گیا
لذت جو نشے میں تھی وہی ہے خمار میں اتنا وسیع مشربِ رندانہ ہو گیا
اللہ رے فریب ترے انتظار کا میں آپ اپنے شوق میں دیوانہ ہو گیا

کہنے چلے تھے حالِ دل اُس شوخ سے اثر
ختم اک ادھوری بات میں افسانہ ہو گیا

کیا شکوہ سنج ہو ستمِ روزگار کا مارا ہوا تری نگہ شرمسار کا
یارب یہ کیسی اپنے چمن میں ہوا چلی ڈوبا ہوا لہو میں ہے دامن بہار کا

طائر کہ آشیاں سے الگ جس کو شام ہو
کیا حال پوچھتے ہو دلِ بے قرار کا

گویا زمانہ بھول گیا اپنی گردشیں
افسوس ہو ایک یہ بھی ترے انتظار کا

منزل اُداس اُداس ہی رخصت ہوا وہ دل
سالار تھا جو قافلۂ انتظار کا

سُن گوشِ ہوش سے کہ چمن کی کلی کلی
رنگین اک ترانہ ہے فصلِ بہار کا

رونے کو اس طرح کے جگر چاہیئے اثرؔ
ہر اشک ایک پھول ہے شمعِ مزار کا

جلوہ نقابِ شاہدِ مستور ہو گیا
خود نور پردۂ رُخِ پُر نور ہو گیا

شہرت پسند حُسن ہی شورش پسند عشق
بدنام ہو گیا کوئی مشہور ہو گیا

منزل سے دور پھرتے ہیں منزل کے شوق میں
دیوانوں کا جو ہو گیا دستور ہو گیا

اس دل پہ ناز کیوں نہ ہو اہلِ نیاز کو
با وصفِ اختیار جو مجبور ہو گیا

جنت سکون طلب ہے اب اس کا کیا علاج
زاہد کے واسطے وہ غمِ حور ہو گیا

ہمت نہ ہار میں نے یہ دیکھا ہے بارہا
تاریکیاں جہاں تھیں وہیں نور ہو گیا

اک عزم استوار کہ لغزش نہ ہو جسے
یہ راز تھا کہ شہرۂ منصور ہو گیا

معصومئ نیاز کے قربان جائیے
جو اُس نے کہہ دیا وہی منظور ہو گیا

اُس آشیاں کی یاد نہ تڑپائے کیوں اثرؔ
حلقے میں بجلیوں کے جو محصور ہو گیا

موت سے زندگی کو چھین موت کو زندگی بنا
مرد ہیں ٹالتے یوہیں ادوارِ مصیبت و بلا

جوش و خروش موج ہے عکسِ تلاطمِ حیات — بحر سے ہمکنار ہو آئے نہ آئے ناخدا
کوئی پیام تازہ دے جس سے کہ جاگ اُٹھے جہاں — دیکھے طلوعِ صبح تو پائے کشادہ تر فضا
تجھ کو یہ حق ہے وہ کہے جس کا تجھے یقین ہے — بات مگر وہ چاہیئے جس سے ہو طبع کی جلا
ڈھونڈ نئی حقیقتیں اور ہو اُن کا ترجماں — چاہیے قدم قدم پہ ہو خوف و خطر کا سامنا
پرچمِ راستی اُٹھا ایک بھی راستی کا بن — راستی وہ جو ہم سخن تجھ سے ہوئی ہو برملا
فرقہ پرستیوں کا نام رکھا ہے تو نے انقلاب — اس سے کہیں وسیع ہے دائرہ انقلاب کا
نظمِ جہاں کے مدعی پہلے کر اپنی تربیت — دیکھ تو پاس ہے ترے کچھ بھی ہوس کے ماسوا
میرے لئے جو نیش ہے تیرے لئے وہ نوش ہے — فیصلہ ہو تو کس طرح کیا ہے بھلا بُرا ہے کیا
پست کو اس قدر اُبھار پست و بلند ایک ہوں — پہلے وہ ذہنیت مٹا جو ہے فساد کی بنا
راحت و عیش کے لئے خون ضمیر کا نہ کر — کام فریب سے نہ لے بہرِ حصولِ مدعا
اپنا حریف آپ بن راز خودی کا ہے یہی — فاتحِ خود شکن جو ہے معرکہ اس نے سر کیا
عزم و ثبات و ولولہ حسنِ عمل سکونِ قلب — جس کو یہ نعمتیں ملیں دونوں جہاں وہ پا گیا

روح میں روشنی جو ہے ماند نہ ہونے دے اثر
اس کی تجلیوں سے ہے فکر و نظر کا ارتقا

نگار خانۂ حسن و جمال ہو جاتا — جو عشق آپ ہی اپنا مآل ہو جاتا
رہِ طلب میں جو دل پائمال ہو جاتا — اسیرِ قافلۂ ماہ و سال ہو جاتا
کہاں سے لائیے اب شوق کی وہ محویت — کہ حسنِ دوست کا پرتو خیال ہو جاتا

ہزار پردوں میں رکھتی چھپا کے بادِ صبا
جو گل بھی تجھ سا بفرضِ محال ہو جاتا

تری تلاش میں ایسی بھی منزلیں آئیں
یقیں پہ شائبۂ احتمال ہو جاتا

کشاکشِ غمِ ہستی کا شکوہ سنج نہ ہو
بغیر اس کے تو جینا وبال ہو جاتا

اک ایسا دور بھی گزرا اثرؔ محبت میں
سخن جو تا بلب آتا سوال ہو جاتا

شور کرتا ہی جرسِ عزمِ سفر ہونے تک
ضبطِ فریاد نہ بن جائے سحر ہونے تک

یہ کرم تو نہیں جو ناز پہ تیرے ہو گراں
غم سے محروم نہ کر خونِ جگر ہونے تک

کس سے بیدادِ محبت کی شکایت کیجے
نہ رہی اپنی خبر اُس کو خبر ہونے تک

لذتِ درد کہیں خود ہی نہ حاصل بن جائے
منزلِ ہوش سے مستانہ گزر ہونے تک

اب جو بیدار ہوئے بھی تو نتیجہ معلوم
زندگی خواب میں گزری ہی سحر ہونے تک

یہ تو آنسو ہیں یہ کہہ کر نہ کئے اُس نے قبول
میں نے کچھ پھول چنے تھے جو سحر ہونے تک

پھر کہاں درد کہاں شورشِ درماں طلبی
سب یہ ہنگامے ہیں اک تیری نظر ہونے تک

یوں تو ہر قطرے کو ہے بحر سے اک ربط مگر
پاک آغوش ہے درکار گہر ہونے تک

دشت پیمائیٔ وحشت نہیں آساں اثرؔ
کتنے ہی مرحلے ہیں خاک بسر ہونے تک

وہ زندگی کی حلاوت سے دور رہتے ہیں
جو بدنصیب محبت سے دور رہتے ہیں

کبھی سمجھ نہ سکے اپنے نفس کے بندے
کہ فکرِ عیش میں راحت سے دور رہتے ہیں

یہ جانتے ہوئے شہرت ہے منتظر اُن کی
جو باکمال ہیں شہرت سے دور رہتے ہیں

یہی ہے آئینۂ دل کی تیرگی کا سبب
جو خود نگر ہیں وہ نفرت سے دور رہتے ہیں

صفات و ذات میں تفریق ہم نہیں کرتے
طلسم بندئ کثرت سے دور رہتے ہیں

وہ خاک عشق کی عصمت کے پاسباں ہوں گے
جو اپنے دل کی طہارت سے دور رہتے ہیں

ہوا کے ساتھ بدلنا ہمیں نہیں آتا
بلا سے امن و فراغت سے دور رہتے ہیں

اثرؔ یہ سچ ہے کہ ہم میں ہنر نہیں کوئی
ہزار شکر دنارت سے دور رہتے ہیں

تم سے حسین کم ہیں مگر ہیں کہیں کہیں
گفتار ایسی دیکھی نہیں دلنشیں کہیں

روٹھے ہوئے کو لاکھ منانے کی سعی کی
قسمت کا خط ہو مٹتی ہے چینِ جبیں کہیں

مطلب جو شیخ کا ہے وہی برہمن کا ہے
یوں ہی سا اختلاف ہو وہ بھی کہیں کہیں

جنت بھی میکدہ تھی ذرا فرق کر دیا
ارزاں ہوئی شراب کہیں انگبیں کہیں

اے شوق ناتمام ہوا سامنا تو کیا
باتیں جو کہنے کی تھیں وہی جب نہیں کہیں

کیا یہ بھی منتظر ہیں کسی کے مری طرح
دامن میں ہیں سحر کے جو تارے کہیں کہیں

دنیائے شوق جس میں سمٹ آئی ہو اثرؔ
سجدے میں جھک کے اُٹھتی ہو ایسی جبیں کہیں

وہی ہیں ہم وہی تم ہو وہ روزگار کہاں
جھجک دلوں میں جب آئی تو اعتبار کہاں

بہائے عشق و جنوں جز دلِ فگار کہاں
متاعِ صبر کہاں جانِ بے قرار کہاں

ہزار نغمے تھے وابستہ ہر نگاہ کے ساتھ
وہ ابتدائے محبت کا کاروبار کہاں

بجھی بجھی سی ہیں شمعیں اُداس اُداس ہے دل
وہ شام وعدہ وہ نیرنگ انتظار کہاں

ابھی ہے عشق میں اک شائبہ تمنا کا
ابھی وہ نشہ کہ جس میں نہ ہو خمار کہاں

کدھر ہے دھیان ترا اے دل ہوس گشتہ
سوائے جبر تجھے اُلفت میں اختیار کہاں

ہنوز شوق کی اپنے ہے جلوہ سامانی
ہنوز عشق ہوا حُسن سے دوچار کہاں

مژہ سے ٹپکے ہوئے خون آرزو کی قسم
خبر نہیں کدھر آئی، گئی بہار کہاں

منزل کا اعتبار بڑھاتے چلے چلو
کانٹے رہ طلب کے ہٹاتے چلے چلو

ذروں کو آفتاب بناتے چلے چلو
دیدہ وری کی شان دکھاتے چلے چلو

ہر منظر حیات کو مانند صبح نو
اک پیکر جمیل بناتے چلے چلو

لغزش بھی ہو قدم کو تو مستانہ وار ہو
اتنا تو کیف زیست بڑھاتے چلے چلو

دانشوروں میں کفر نہیں اس کے ماسوا
آپس کا اختلاف مٹاتے چلے چلو

کانٹوں کو روندتے ہوئے شعلوں سے کھیلتے
ہر ہر قدم پہ دھوم مچاتے چلے چلو

نیرنگ ہست و بود فریب نظر سہی
بیحد حسیں فریب ہی کھاتے چلے چلو

زندانِ ماومن میں بہت رہ چکے اسیر
اب قید ماومن کی اُٹھاتے چلے چلو

گرد دغا کے دام بچھاتے جو ہیں بچھائیں
تم نیکیوں کے نقش بٹھاتے چلے چلو

تعمیر عصر نو کی تمہیں میں ہے اہمیت
قول و عمل سے اپنے جتاتے چلے چلو

ہے شرطِ احتیاط یہی خار ہو کہ گُل — دامن کو غیرِ حق سے بچاتے چلے چلو

بُجھتے ہوئے چراغ بھی کام کے اثرؔ
شمعیں نئی انھیں سے جلاتے چلے چلو

بہارِ دیدۂ خونتابہ افشاں دیکھتے جاؤ — سجایا ہے غموں نے جو گلستاں دیکھتے جاؤ

سرشکِ خوں سے مژگاں پر چراغاں دیکھتے جاؤ — دکھائے جو بھی عشقِ داغ ساماں دیکھتے جاؤ

ہنسو ہاں ہاں ہنسو ہم بیکسوں کی خستہ حالی پر — مگر اپنا بھی اندازِ پشیماں دیکھتے جاؤ

کبھی اشکِ تمنا سے کبھی داغِ تمنا سے — ہماری شام ہے اختر بداماں دیکھتے جاؤ

اگر مدِ نظر ہوش و خرد کی آزمائش ہے — شکن اندر شکن وہ زلفِ پیچاں دیکھتے جاؤ

اٹھائے کون احساں، چارہ گر کی منتیں کیسی
اثرؔ خود درد ہو جائے گا درماں دیکھتے جاؤ

آفت میں پڑ گئے دلِ آفت نشاں کے ساتھ — چاہت نباہنا ہو اور اک بدگماں کے ساتھ

صیاد تاک میں ہے الگ، باغباں الگ — اک برق ہی کو لاگ نہیں آشیاں کے ساتھ

یا مشغلہ تھا نالہ و فریاد ایک دن — یا دل میں ہوک اٹھتی ہے قصدِ فغاں کے ساتھ

اس واسطے کہ چین نہ آئے لگی رہیں — دو چار حسرتیں دلِ بے خانماں کے ساتھ

یہ کون راہِ شوق میں برباد ہو گیا — اک ناتواں غبار بھی ہے کارواں کے ساتھ

کوئی ادھوری بات کہو اور چپ رہو — ہے لطفِ گفتگو کا یہ ہی بے زباں کے ساتھ

نیرنگ روزگار کا آئینہ ہے چمن — اک ربط ہے بہار کو غافل خزاں کے ساتھ
پیشانیٔ نیاز کا اللہ رے فروغ — سجدوں کی بھی ہے دھوم ترے آستاں کے ساتھ
اہلِ نظر کہیں یہ کسی دن عجب نہیں
لطفِ سخن گیا اثرؔ خوش بیاں کے ساتھ

داستانِ غمِ دل اُس کو سُنائی نہ گئی — ضبط کی قید تھی ایسی کہ اُٹھائی نہ گئی
اُس نے تسکین جو دی اور بھی شعلے بھڑکے — آگ وہ دل میں لگی تھی کہ بجھائی نہ گئی
کام کچھ آئی نہ مشاطگیٔ بادِ بہار — گل میں تیری سی ادا ایک بھی پائی نہ گئی
دلِ مشتاق سے جب الجھی وہ بیباک نگاہ — چوٹ کھانے کے سوا چوٹ بچائی نہ گئی
تیری مرضی جو یہ دیکھی تو بہت کوشش کی — کیا کروں دل سے تری یاد بھلائی نہ گئی
کام آتی جو کسی کے تو امر ہو جاتی — زندگی موت کے پھندے سے چھڑائی نہ گئی
یوں تو ہیں خوب رواں باتیں بنانے میں اثرؔ
سامنے اُس کے کوئی بات بنائی نہ گئی

آہ سے حبّ دل میں ڈوبے تیر اُبھارے جائیں گے — دیکھ لینا دور تک اڑ کر شرارے جائیں گے
رات کی تاریکیاں لے کر ستارے آئے تھے — رات کی تاریکیاں لیکر ستارے جائیں گے
موجِ طوفاں کو جنھوں نے چیرنا سیکھا نہیں — اس کنارے سے بھلا کیا اُس کنارے جائیں گے
اتنی ہی رنگین ہوتی جائے گی اپنی نظر — جس قدر تیرے تصور کو سنوارے جائیں گے

کچھ نہ کچھ ہو ہی رہے گا دردمندی کا مآل
جان کے دشمن تجھی کو ہم پکارے جائیں گے

ہوشیار اے بادۂ نخوت کے ماتے ہوشیار
طنطنے رکھے رہیں گے سب اجارے جائیں گے

ایک حرف دل نشیں یہ بھی نہیں تو اک نگاہ
دور جانیوالے کیونکر بے سہارے جائیں گے

ہجوم یاس و غم بے حساب کیا معنی
کنار شب میں نہ ہو آفتاب کیا معنی

اسیر اپنی خودی کے کبھی سمجھ نہ سکے
بغیر بحر نمود حباب کیا معنی

کہاں سے آئی طلوع سحر میں رعنائی
خروش بحر و شب ماہتاب کیا معنی

نسیم سرخوش صہبائے رنگ و بو کیوں ہے
بہم یہ چشمک برق و سحاب کیا معنی

یہ کس نے درد بھرا ہے نوائے بلبل میں
بہار اور گلوں کا شباب کیا معنی

نگاہ دور رس و پاکباز پیدا کر
جمال دوست نہ ہو بے نقاب کیا معنی

کوئی تو ربط ہے ناز و نیاز میں ورنہ
نگاہ شوق سے تیرا حجاب کیا معنی

گناہگار ہوں اقرار ہے گناہوں کا
سزا دے یہ سر محشر حساب کیا معنی

گرا دے خرمن دل پر نگاہ کی بجلی
عنان شعلہ بدست عتاب کیا معنی

تو کیا یہ سمجھوں کہ تجدید عہد بھی ہوگی
تو پھر یہ پرسش حال خراب کیا معنی

کدھر ہے دھیان ترا امن و عیش کے جویا
حیات بے خلش اضطراب کیا معنی

نہیں جو غیر کی تو نفس کی غلامی ہے
یہ دیکھنے کا فقط انقلاب کیا معنی

اگر نہیں ہو مساوات ہی کی دھن اے دوست
تو پھر یہ نغمۂ چنگ و رباب کیا معنی

ضرور معتکفِ خانقہ تھے آپ اثرؔ
مگر یہ خرقہ و داغِ شراب کیا معنی

ہم اسیروں کی فغاں کا یہ اثر ہوتا ہے — آشیاں رہگزرِ برق و شرر ہوتا ہے
سرفروشانِ محبت پہ خدا کی رحمت — راہ چلتے ہیں وہی جس میں خطر ہوتا ہے
بجلیاں کوندتی ہیں دل میں کبھی دل سے دور — نالہ ہنگامہ طلب وقتِ سفر ہوتا ہے
ایک اک سانس ہو پیغامِ جراحت پئے دل — جب کہیں دردِ محبت میں اثر ہوتا ہے
یاد آتا ہے کسی شوخ کا اندازِ حیا — شبنم آلود جو رخسارِ سحر ہوتا ہے
حیف اے مردِ خدا حیف یہ افسردہ دلی — سینۂ سنگ میں بھی ورنہ شرر ہوتا ہے
ہوش رہتا ہے کسے دوری و مہجوری کا — نشہ چھایا ہوا ہنگامِ خبر ہوتا ہے
گل سے جب نکہتِ گل ہوتی ہے مل مل کے جدا — ہو نہ ہو وہ ترا ہنگامِ سفر ہوتا ہے
دلِ بیدار بھی ہو دیدۂ بیدار کے ساتھ — نورِ خورشید جبیں سازِ سحر ہوتا ہے

آہ کا بس جو چلے توڑ کے پہلو رکھ دے
کم جو دم بھر کو اثرؔ دردِ جگر ہوتا ہے

مسلسل

فکر کیوں ثابت کوئی تقصیر ہونا چاہیئے — خود محبت جرم ہے تعزیر ہونا چاہیئے
جوش زن ایک سیلِ خوں ہو جس طرف جائے نظر — کیا نظامِ نو یوں ہی تعمیر ہونا چاہیئے

جاگزیں ہے تیرے دل میں حکمرانی کی ہوس
پہلے اپنے نفس کی تسخیر ہونا چاہیئے

بحر بن سکتا نہیں تو موجِ طوفاں خیز ہو
اک نہ اک سودا بہرِ تقدیر ہونا چاہیئے

بھولے بسرے نعرۂ تکبیر سے کیا فائدہ
زندگی خود نعرۂ تکبیر ہونا چاہیئے

حیف ایسی زندگی خالی جو سرگرمی سے ہو
پیچ و تاب شعلہ سے تعبیر ہونا چاہیئے

خود نسیمِ روح پرور آئے گی تیری طرف
رنگ و بو کی مثلِ گل تدبیر ہونا چاہیئے

کیوں حریصِ بادۂ گلرنگ ہو خود زیست میں
بادۂ گلرنگ کی تاثیر ہونا چاہیئے

کچھ نہیں تو قائلِ تقدیر ہونے کے لئے
جہد ہونا چاہیئے تدبیر ہونا چاہیئے

جو بھی نقش ابھرے وہ ہو فطرت کا نادر شاہکار
عصرِ نو اس شان سے تعمیر ہونا چاہیئے

میں نے جب پوچھا اثرؔ سے مدعائے زندگی
کہہ دیا خود اپنی ہی تفسیر ہونا چاہیئے

متفرق

حُسن کی نیرنگ سازی کا یہی ہے مدعا
عشق کو بھی حُسن کی تصویر ہونا چاہیئے

اک شعاعِ نور تھی جو دل کو روشن کر گئی
میں تو سُنتا تھا نظر کو تیر ہونا چاہیئے

ادھر دیکھتے ہی جو گردن جُھکا لی
تو کیا اُس نے دل کی مرے بات پا لی

اس انداز سے پہلے کھلتی نہیں تھی
کلی نے تری مسکراہٹ چُرا لی

سوال آپ کرنا جواب آپ دینا — یہ فرقت میں تسکیں کی صورت نکالی
ہمیشہ دل آزار سے دل لگایا — محبت کی دنیا کی رسمیں نرالی
ہوا اس کے طعنوں پہ جب ضبط مشکل — بھری ٹھنڈی سانس اور گردن جھکالی
نہ آیا ہمیں راس بدلا زمانہ — وہی دردمندی وہی خستہ حالی
نہ کیوں زیست ہی سر بسر معصیت ہو — اگر درد انسانیت سے ہے خالی
جو آہ سحر کی تپائی ہوئی تھی — وہ بجلی بھی اپنے ہی دل پر گرالی

تامل ہوا آج پہچاننے میں
اثر کس کے غم میں یہ صورت بنالی

دور ہے انسانیت کے اوج کی منزل ابھی — ہے ترا ذوق عمل وابستۂ حاصل ابھی
تو اگر حائل نہ ہو خود اپنے شوق دید میں — لیلیٰ محمل الٹ دے پردۂ محمل ابھی
ناگہاں جیسے وہی جان تمنا آگیا — چپکے چپکے نام جس کا لے رہا تھا دل ابھی
گو برابر اٹھتے جاتے ہیں حجابات نظر — دور بھی اور دور ہے دل والوں کی منزل ابھی

شکوہ سنج نامرادی ہو جو تم پیہم اثر
تشنگی عشق میں لذت نہیں شامل ابھی

ہر اک ذرے میں اک دنیا بسی دیکھی نہیں جاتی — جو یوں دیکھی نہ جائے زندگی دیکھی نہیں جاتی
محبت میں اک ایسی منزل دشوار آتی ہے — اندھیرے کے سوا جب روشنی دیکھی نہیں جاتی
غلط ہو لاف آگاہی یہ غفلت ہے کہ آگاہی — جو ہستی ماورائے نیستی دیکھی نہیں جاتی

ترے غم میں وہ لذت ہے خدا رکھے ترے غم کو
خوشی پر دسترس ہوتے خوشی دیکھی نہیں جاتی

حیات و مرگ کے اسرار آئینہ نہیں ہوتے
الگ مرنے سے جبتک زندگی دیکھی نہیں جاتی

وہاں سودا ہے انساں کو مشیت کے بدلنے کا
یہاں اک ذرے کی آوارگی دیکھی نہیں جاتی

یہاں ہر گام پر فکر و تامل کی ضرورت ہے
یہ دنیا بندہ پرور سرسری دیکھی نہیں جاتی

اب اس کے بعد کیا چارہ خلشہائے فراواں کا
ستمگر سے جفا آسودگی دیکھی نہیں جاتی

ادھر سے آج وہ گزرے تو منھ پھیرے ہوئے گزرے
اب اُن سے بھی ہماری بیکسی دیکھی نہیں جاتی

بلا سے دل تڑپتا ہے تمنائیں سسکتی ہیں
اثر دردِ محبت میں کمی دیکھی نہیں جاتی

اک بے وفا پہ جان کو وارے چلے گئے
بازی لگا کے عشق کی ہارے چلے گئے

طعنے وہی ہیں طنز وہی چشمکیں وہی
ہم سے تھے جو سلوک تمہارے چلے گئے

رعنائیوں کے ساتھ ہی دشواریاں بڑھیں
جتنا بھی زندگی کو سنوارے چلے گئے

اب وہ تصورات کی رنگینیاں کہاں
گلزار بے خودی کے نظارے چلے گئے

لو اور بدگمان بت بدگمان ہوا
جتنا بھی آرزوؤں کو مارے چلے گئے

ان کو نشاط جوشی طوفاں کی کیا خبر
جو ڈوبنے کے ڈر سے کنارے چلے گئے

رسوائیوں میں آج اثر کی کسر نہ تھی
اُسکی نگاہ ناز کے مارے چلے گئے

مقصودِ زندگی نہیں حب وطن ابھی
اپنا سہاگ ڈھونڈ رہی ہے دلھن ابھی

جو انتخاب تھے چمنِ روزگار کے
میری نظر میں ہیں وہی سرو و سمن ابھی

دعویٰ ہے اتحاد کا باطل خطا معاف
دل ہمکلام ہیں نہ زباں ہم سخن ابھی

جس کے لئے ضمیرِ محبت ہے بے قرار
پھوٹی نہیں افق سے وہ چنچل کرن ابھی

جو پھول ہو بہار کا چشم و چراغ ہو
مالی ترا چمن نہیں ایسا چمن ابھی

پامال ہوتے ہوتے بھی خوشبو لٹا گئے
سیکھا نہیں بشر نے گلوں کا چلن ابھی

جھک جھک کے ملنے والے ذرا آنکھ تو ملا
افسانہ کہہ رہی تھی جبیں کی شکن ابھی

دورِ نشاط آئے گا بدول نہ ہو اثرؔ
قائم نہیں ہوا ہے مزاجِ وطن ابھی

۱۹۴۹ء

تصویرِ محبت دلِ دیوانہ بنے گا — رنگین خیالوں کا پری خانہ بنے گا
نازک سے بھی نازک تری پلکوں کا اشارہ — افسانہ در افسانہ اک افسانہ بنے گا
یونہیں جو چٹکتی رہیں امید کی کلیاں — ہر جذبۂ دل نغمۂ مستانہ بنے گا
انداز یہی ہے جو تری جلوہ گری کا — ہر جلوے سے اک تازہ صنم خانہ بنے گا
رچ جائیگا اس میں وہی انداز بھی ترا — جو تیرے حسین انداز کا دیوانہ بنے گا
یہ کیا تھی خبر اُس لبِ میگوں کا تبسم — لب تشنگیٔ شوق کا پیمانہ بنے گا
ماضی کے دھندلکے کی طرف دیکھنے والو — سب کاہش امروز تو فردا نہ بنے گا

آئینۂ اثر ہوں گے جب اسرارِ حقیقت
یہ جاگنا بھی خواب کہ افسانہ بنے گا

ہجومِ نالہ و ہنگامۂ و فغاں لے کر — چلا ہے اے دلِ ناداں مجھے کہاں لیکر
کبھی تو سُن لے کہ لکھا ہے میں نے افسانہ — تری نگاہ سے رنگینیٔ بیاں لے کر
جب اتنا جذب نہیں سجدہ پاشیاں بے سود — جبیں جھکے تو اُٹھے نقش آستاں لے کر

یہی نہیں کہ ہمیں ہمصفیر بھول گئے — صبا نہ آئی کبھی بوئے گلستاں لے کر
ہزار بار قفس اُس چمن سے بہتر ہے — بہار آئے جہاں تلخئ خزاں لے کر
زبانِ حال سے کہتے ہیں یہ شکستہ مزار — زمین بیٹھ گئی کتنے آسماں لے کر

اب اس کے بعد اثرؔ کیا نباہ کی صورت
وہ سرگراں ہیں محبت کا امتحاں لے کر

خوشی دائمی ہے نہ غم جاودانہ — ہر اک لَے میں دُھرا ہی اک ترانہ
تغیر کو تعبیر یوں بھی کیا ہے — کہ دم لیکے بڑھتا ہے آگے زمانہ
جہاں مل گئے دو محبت بھرے دل — کہا اک فسانہ سُنا اک فسانہ
چمن سے کلی بڑھ کے جھنجھن جان پیاری — چمن سے اُٹھا لے گئے آشیانہ
نہ تم سُن سکو گے نہ ہم کہہ سکیں گے — بہت دکھ بھرا ہے ہمارا فسانہ
ادائیں نکلنے لگی ہیں جفا میں — محبت کا اب آ رہا ہے زمانہ
معاذ اللہ عصیاں کی ریشہ دوانی — وہ ہو ایک خرمن جو تھا ایک دانہ
شفق کیا ہی شرمائی سُن کر سحر سے — تری چشم میگوں کا رنگیں فسانہ

اثرؔ اب وہ مدفن ہے تیرہ شبی کا
تجلی کا جو دل تھا آئینہ خانہ

حد صبر و ضبط سے اک دن گزر جانا بھی ہے — بندشوں کو توڑ کر قصر ستم ڈھانا بھی ہے
صرف اپنا ہی نہیں دنیا کا غم کھانا بھی ہے — درس یکجہتی زمانے بھر میں پھیلانا بھی ہے

زندگی تقسیم ہو کر زندگی رہتی نہیں — اسکی وحدت کو سمجھنا اور سمجھانا بھی ہے
وہ سیاست جسکے آگے سر جھکائے کائنات — اُسکا پرچم دستِ صبحِ نو میں لہرانا بھی ہے
وہ اخوت جس کا ہے معیار ایثار و خلوص — اُس کا کلمہ خود بھی پڑھنا اور پڑھوانا بھی ہے
وہ صداقت زندگی اک جرم ہو جسکے بغیر — امتحاں گاہِ عمل میں اُسکے گُن گانا بھی ہے
وہ نڈر پن جو پرکھتا ہے کھرا کھوٹا یہاں — اُس کا لوہا منکرانِ حق سے منوانا بھی ہے
مدعی جو جو قیادت کے ہیں سُن رکھیں ذرا — راہ پر لانے سے پہلے راہ پر آنا بھی ہے
سیکھ لے پھولوں سے غافل مدعائے زندگی — خود مہکنا ہی نہیں گلشن کو مہکانا بھی ہے
جوت کو دل کی جگا حسنِ عمل سے متصل — جس طرح لازم دئے کی لَو کو اُکسانا بھی ہے
خوب بُنئے خوب بُنئے لیکن اتنا سوچئے — ان میں ہے تانا ہی تانا یا کہیں بانا بھی ہے
تم سمجھتے ہو بجز اُفتادگی کچھ بھی نہیں — عشق کا شیوہ اکڑنا اور بَل کھانا بھی ہے

خود ہی سرشارِ مے اُلفت نہیں ہونا اثرؔ
اس سے بھر بھر کر دلوں کے جام چھلکانا بھی ہے

فریبِ شوق دمِ انتظار دیکھا ہے — نہ دیکھنے پہ تجھے بار بار دیکھا ہے
یہی نہیں کہ دلوں میں غبار دیکھا ہے — شکستہ آئینۂ اعتبار دیکھا ہے
تو کیا مرے ہی طرح تم نے صبح کے تارو — گزرتے قافلۂ انتظار دیکھا ہے
یہ عشق کیوں نہ ہو رسوا کہ سامنے اُسکے — گلہ زباں پہ تو آنکھوں میں پیار دیکھا ہے
بسا لیا ہے تجھے جس نے اپنے خوابوں میں — تغیرات کو ناپائدار دیکھا ہے

نہ اُٹھ رہے گی جفا اب کوئی مرا قدمہ — اگر جفا سے اُسے شرمسار دیکھا ہے
شرابخوار ہوں انگڑائیاں نہ کیوں آئیں — کسی کی چشم سیہ کا خمار دیکھا ہے
یہ کس نے ناز سے انگڑائی لیکے منہ پھیرا — کہ موج بادہ کو رہن فشار دیکھا ہے
قدم زمین پہ رکھتے نہ تھے جو نخوت سے — اُنھیں کو بیٹھے سرِ رہگزار دیکھا ہے

سحر کا رنگ ہو فق دیکھ لے کبھی جو اثر
ستم جو میں نے شبِ انتظار دیکھا ہے

بہم سی اک خلش ہی دل ناتواں رہے — کوئی تو شوق بے سروپا کا نشاں رہے
پائے طلب جو شل ہو تو شورِ طلب بڑھے — دیوانگی میں قیمتِ وحشت گراں رہے
اسرارِ کائنات ہوں آئینہ سر بسر — انسان پر جو عظمتِ انساں عیاں رہے
عشق اُسکا عشق اور وفا اُسکی ہو وفا — باوصفِ اختیار جو دامن کشاں رہے
شوریدگانِ عشق کی ہے منزلِ مراد — خود موت کی زباں پہ جہاں الاماں رہے
گزری جو مجھ پہ گزری دلِ خانماں خراب — یادش بخیر تو ہے جہاں شادماں رہے
آ زندگی کے نام پہ نغمے لُٹائیں دوست — اور اس سے بے نیاز کہ نام ونشاں رہے
کوئی نہ کوئی خانہ بر انداز چاہیئے — ہنگامۂ نشاط کہ شورِ فغاں رہے
اُس لعل لب پہ یوں ہے تبسم کی اک جھلک — جیسے گہر میں موجِ گہر ضوفشاں رہے
آئینے سے سوال ہے اُن کے شباب کا — آنکھوں میں جب حیا ہے شوخی کہاں رہے
ساقی بہت ہی دور زمانہ نکل گیا — کچھ اور تیز گردشِ رطلِ گراں رہے

جب آدمی کے خون کا پیاسا ہو آدمی
پھر کیوں نہ تہلکے میں اثرؔ کُل جہاں رہے

شمع بجھی سحر ہوئی بزم تمام ہو چکی
دور ہے اب خمار کا گردش جام ہو چکی

دل میں چہل پہل جو تھی کب کی تمام ہو چکی
منزل ماہ نیم شب ہُو کا مقام ہو چکی

رنگ بہار و بوئے گل نرگس و نسترن سمن
حُسن کی تیرے داستاں اتنی تو عام ہو چکی

شام تمام عیش تھی صبح پیام عیش تھی
ایسی بھی صبح دیکھ لی ایسی بھی شام ہو چکی

ایک بھی مثل نقش پا گُل نہ چمن میں کھل سکا
باد صبا تری طرح "مست خرام" ہو چکی

ایک ہی رنگ محویت ایک ہی کل انتظار
شام بھی صبح ہو چکی صبح بھی شام ہو چکی

پہلے ہی کہتے تھے اثرؔ کھیل نہیں ہے شاعری
کہئے کہ شعر بھی کہا مشق کلام ہو چکی

نکہت میں رنگ رنگ میں مستی شراب کی
تصویر ایک یہ بھی ترے شباب کی

اُس لعل لب پہ یوں ہے تبسم کی اک جھلک
جیسے شفق میں ڈوبی کرن آفتاب کی

اک دوسرے کے حُسن و محبت میں ہیں گداز
حاجت سوال کی نہ ضرورت جواب کی

اُدھر وہ پرسش حال تباہ کر نہ سکے
اِدھر ہم آنکھ ملے پر بھی آہ کر نہ سکے

نہ اعتراف ندامت نہ التجائے کرم
گناہ کرتے رہے جو گناہ کر نہ سکے

حیائے عشق نے مارا گلہ تو ایک طرف
زباں کو حالت دل کا گواہ کر نہ سکے

تو کیا یہ سمجھوں تغافل حیا کا پردا ہے — ادھر جو آپ پلٹ کر نگاہ کر نہ سکے
خطا کچھ اس میں ہماری بھی پائی جاتی ہے — کچھ آپ اپنی طرف سے نباہ کر نہ سکے
نیاز عشق کی مجبوریاں معاذ اللہ — اُچٹتی سی بھی اُدھر اک نگاہ کر نہ سکے

اثرؔ تمھیں اسی دانشوری پہ غرّہ تھا
شمارِ عمر بجز سال و ماہ کر نہ سکے

پردے میں انتظار کے اک فتنہ گر بھی ہے — وارفتگان شوق تمھیں کچھ خبر بھی ہے
شامل مذاقِ دید میں حُسنِ نظر بھی ہے — اب عشق جلوہ ساز بھی ہے جلوہ گر بھی ہے
یہ حال کیا ہے اے دلِ برباد آرزو — بسمل دعا کے ساتھ دعا کا اثر بھی ہے
ٹھکرا کے چلنے والے نہ سوچے یہ بیشتر — ہر سنگریزہ مسکنِ برق و شرر بھی ہے
کس رُخ سے دیکھنا ہے یہ تجھ پر ہے فیصلہ — منزل بھی یہ جہاں ہے یہی رہگزر بھی ہے
یہ کہہ رہی ہے ایک اُبھرتی ہوئی کرن — میں ہوں نوید جس کی اک ایسی سحر بھی ہے
آرائشِ جمال میں یہ اہتمام کیوں — کیا اہلِ ہوش میں کوئی صاحبِ نظر بھی ہے
قیدِ قفس میں یادِ نشیمن کے ماسوا — رنگِ شکستہ کو ہوسِ بال و پر بھی ہے

کس کو اثرؔ سُنائیے محبت کا ماجرا
کوئی حریفِ لذتِ دردِ جگر بھی ہے

یہ عالم نہیں ہے وہ عالم نہیں ہے — کوئی منزلِ ابنِ آدم نہیں ہے
محبت کی اللہ ری پردہ داری — تمنا تمنا کی محرم نہیں ہے

عجب وحشتِ دل نے انداز بدلا
کسی سے سوا اپنے اب ہم نہیں ہے

خفا تو نہ ہوں گے جو اک بات پوچھیں
وہ ہے کون وعدہ جو مبہم نہیں ہے

محبت ہے وہ درد جس کا مداوا
بظاہر بجز کاہشِ غم نہیں ہے

اُسے ٹوک کر کہہ دے کہنا ہی جو کچھ
دلِ زار اتنا بھی کیا دم نہیں ہے

وہی جینے والے وہی مرنے والے
تری دلبری کا وہ عالم نہیں ہے

نہ جانے کدھر جا رہی ہے یہ دنیا
کسی کا یہاں کوئی ہمدم نہیں ہے

بحمد اللہ باوصف حرماں نصیبی
اثر مستیٔ عشق کچھ کم نہیں ہے

بحمد اللہ قوی تر ہمتِ دل ہوتی جاتی ہے
رسائی تا بمنزل جتنی مشکل ہوتی جاتی ہے

یہی منشا تھا شاید ناخدا کی کم نگاہی کا
طلب ساحل کی رفتہ ساحل ہوتی جاتی ہے

یہاں تک تو پرستش کی گئی اوہامِ باطل کی
کہ ہستی سر بسر اک نقشِ باطل ہوتی جاتی ہے

نظر جتنی گزرتی ہے تعیّن کے حجابوں سے
حقیقت مثلِ آئینہ مقابل ہوتی جاتی ہے

نیا ساقی نئے میکش نئے مطرب نئے نغمے
نئے انداز سے ترتیبِ محفل ہوتی جاتی ہے

گئے وہ دن کہ سرگرمِ طلب تھے شوقِ منزل میں
اب ایک ایک آرزو خود اپنی منزل ہوتی جاتی ہے

اضافہ جس قدر ہوتا ہے تیری بے نیازی میں
اُسی نسبت سے افزوں نازشِ دل ہوتی جاتی ہے

اُسی کو اصطلاحِ عشق میں جنت بھی کہتے ہیں
وہ اک لذت جو دردِ دل میں شامل ہوتی جاتی ہے

اثر یہ جانتا ہوں جہد کا حاصل نہیں لیکن
پئے تسکینِ خاطر جہد حاصل ہوتی جاتی ہے

ایک اک جذبۂ دل حسن کا دفتر نکلے — عشق کا راز اگر پردے سے باہر نکلے
ساقیا تیرا تبسم بھی جو مل کر نکلے — شیشے سے جیسے پری بادۂ احمر نکلے
ایک تحریک میں شل ہو گئے یا ٹوٹ گئے — شاد تھے طائر آزاد کہ شہپر نکلے
پار ہوتا ہے محبت میں اسی کا بیڑا — ڈوب کر اپنے لہو میں جو شناور نکلے
نہ تری جلوہ گری ہو نہ تری خوش نظری — یوں نکلنے کو فلک پر مہ و اختر نکلے
پردے پردے میں جو اظہار تمنا ہو جائے — کیوں نتیجہ تو دل زار مقدر نکلے
شبنم آلودگیٔ گل بھی فسانہ ہو جائے — اشک خوں ایک تو ایسا مژۂ تر نکلے
آگیا وقت کہ ہمہ دش سحر ہو سب تار — نئے مشرق سے نیا مہر منور نکلے
حال میں ہاں بھی جو ملاؤ تو وہ کہتا ہے اثر — بات کرتے ہو وہی جس میں کوئی شر نکلے

اک ایسا دور بھی اے ساقیٔ میخانہ ہو جائے — کہ خود رفتار نبض وقت کی مستانہ ہو جائے
معاذ اللہ مستی اور ایسے رند کی مستی — لب پیمانہ بھی جس کو لب جانانہ ہو جائے
یہاں تک جوش مستی ہو یہ شان مے پرستی ہو — کہ ہر لغزش سے تعمیر اک نیا میخانہ ہو جائے
خیال تو یہ جب آیا اسی اسلوب سے آیا — کہ مستی سے بے نیاز بادۂ و پیمانہ ہو جائے
چمن ایسا بہار ایسی ہوائے خوشگوار ایسی — قیامت ہے کہ خالی رند کا پیمانہ ہو جائے
ابھی میخانۂ دیدار ہر ذرے میں کھلتا ہے — اگر انساں اپنے آپ سے بیگانہ ہو جائے
عرق آلود ہو جائے مہ و انجم کی پیشانی — در جاناں پہ یوں اک سجدۂ مستانہ ہو جائے
خراب نرگس سرشار ساقی ہو اور اتنا ہو — تری مستی کا خود مستی اثر پیمانہ ہو جائے

کیا دیکھ کے تم کو گُل ہی فقط نکہت سے بہلنا بھول گئے
رنگین شفق کے دامن میں تارے بھی مچلنا بھول گئے

جس زیست کو نغمہ ہونا تھا وہ ایک مسلسل نوحہ ہے
کچھ اس میں کسی کا قصور نہیں ہم دُھن ہی بدلنا بھول گئے

وہ صبح کی پہلی شوخ کرن جو ساز کو دل کے چھیڑتی تھی
کیوں آج وہ سہمی سہمی ہے کیوں نغمے اُبلنا بھول گئے

جو بات بھی ہونی ہو کے رہی ناشاد بھی ہیں برباد بھی ہیں
کچھ تم بھی سہارا دے نہ سکے کچھ ہم بھی سنبھلنا بھول گئے

یہ عیش کے بندے سوتے رہے پھر جاگے بھی تو کیا جاگے
سورج کا ابھرنا یاد رہا اور دن کا ڈھلنا بھول گئے

دیکھیں یہ ہماری بے خبری کیا کیا نہیں لاتی رنگ ابھی
جاتی تھی وہی منزل کی طرف جس راہ پہ چلنا بھول گئے

عاشق سے کہ شاعر سے پوچھو یہ عقل کے پتلے تو اخگر
خوابوں کا حقیقت بن بن کر پھر خواب میں ڈھلنا بھول گئے

بیتاب نگاہی کا اپنی اُس رُخ پہ سماں جب یاد آیا
تو عارضِ گُل پر رہ رہ کر شبنم کا مچلنا بھول گئے

افسوس اخگر کی سادہ دلی کھا کھا کے فریب اُن آنکھوں کا
منت کش لطف پرسش ہیں حیتون کا بدلنا بھول گئے

اور جو کچھ ہو یہ اندھیر نہ ہونے پائے یاس امید کا بیڑا نہ ڈبونے پائے
میں نے مانا کہ ہے اندوہ و مصائب کا ہجوم عزتِ نفس فراموش نہ ہونے پائے
بندۂ عیش جگہ اُن کے لئے خالی کر جو گھڑی بھر نہ کبھی چین سے سونے پائے
خوب ہے جہدِ عمل دھیان رہے بس اتنا زندگی اپنی توانائی نہ کھونے پائے
ہم کو اپنا تو کہا ساقیٔ دریا دل نے بہتی گنگا میں مگر ہاتھ نہ دھونے پائے
خواب کیا کیا تھے سہانے مگر انکی تعبیر کھیلنے کیلئے بچوں نے کھلونے پائے

عقل شل ذہن معطل ہے بدستور اثرؔ
ہو کے آزاد ہم آزاد نہ ہونے پائے

سنہ ۱۹۵۰ء

گزشتہ عیش کے ہم ہیں امیدوار ابھی
پلٹ کے آئے گا جیسے وہ روزگار ابھی

چمن سے گل ہوئے رخصت گلوں سے نکہت و رنگ
سجی گئی بھی نہ تھی محمل بہار ابھی

سراب ہو چکی ثابت ہزار بار مگر
وہی ہیں ہم وہی منزل کا اعتبار ابھی

تجھے خبر نہیں کہتے ہیں سرخوشی کس کو
کہ تیرا نشہ ہے زحمت کش خمار ابھی

یہ کون وحشیٔ لغزش خرام گزرا ہے
کہ محو رقص ہے صحرا میں کچھ غبار ابھی

نگاہ محرم اسرار ہو تو کیوں کر ہو
خیال بھی تو نہیں تجھ سے ہمکنار ابھی

خدا کے واسطے دم بھر کو شکل دکھلا جا
سحر کے رخ پہ ہے گلگونۂ بہار ابھی

اثرؔ خیال و عمل میں ہو خاک یکسوئی
وہ خوش گوار ابھی ہے یہ ناگوار ابھی

اک ہوا ایسی بھی چل کر رہ گئی
ہر تمنا ہاتھ مل کر رہ گئی

یا چٹکتی تھی کلی یا منھ سے آج
اک گھٹی سسکی نکل کر رہ گئی

موت کو ٹوکا یہ کس نے اس طرح
فطرت سرکش دہل کر رہ گئی

کون تھا بربادیوں پہ خندہ زن
خود مشیت بھی سنبھل کر رہ گئی

عشق ہم آغوش منزل ہوگیا
عقل بس دو گام چل کر رہ گئی

ہے فنا کے رنگ میں رنگ بقا
گُل سے بوئے گُل نکل کر رہ گئی

آتشِ غم سے لہو کی بوند بوند
آنسوؤں کے ساتھ جل کر رہ گئی

اُس نگاہ مست کا عالم نہ پوچھ
موج مے کروٹ بدل کر رہ گئی

اب کوئی کس سے کرے کس کا گلہ
آدمیت جب کچل کر رہ گئی

آگیا تھا حرف مطلب تا بلب
وہ تو کہئے بات ٹل کر رہ گئی

اُس نے دیکھا اور یوں دیکھا آخر
ایک اک حسرت مچل کر رہ گئی

خود اپنی تلاش میں گم ہو جا یہ ذوق طلب کا حاصل ہے
اے ہوش کے بندے اس کے سوا جادہ نہ یہاں ہے نہ منزل ہے

جو لوگ شناور بنتے ہیں خود ہی نہ بھنور میں پھنس جائیں
طوفان اُٹھانا آساں ہے طوفاں سے نکلنا مشکل ہے

ہے ایک ہی شعلہ روپ ہیں دو، لرزاں ہے کہیں رقصاں ہے کہیں
مسلک ہے وہی پروانے کا جو شمع سحر کی منزل ہے

اُف شوخ تبسم تیکھی نظر مجروح تھا پہلے دل ہی فقط
اب ہر ارمان تڑپتا ہے ایک ایک تمنا بسمل ہے

عاشق جو نہیں وہ کیا جانے، جانے تو نہ جانے کیا سمجھے
اک غنچہ تھا کہ شگفتہ ہوا دل یوں جو شکستہ ہو دل ہے

جب ہو جائیں اٹھیں مستانہ بہم جوشاں پیچاں پیچاں
ظاہر میں پیام طوفاں ہے در اصل نوید ساحل ہے

یہ قول کسی عارف کا ہے شاید ہو سُنا تم نے بھی اثر
"محکوم تمنا ہو جانا تکمیل خودی میں حائل ہے"

آنکھ میں اشک ندامت ڈبڈبا کر رہ گئے
ہم یونہیں اکثر دعا کو ہاتھ اٹھا کر رہ گئے

کتنے ہی شکوے زباں پر آئے آکر رہ گئے
کچھ نہ کہتے بن پڑا گردن جُھکا کر رہ گئے

کیسی کیسی بیقراری میں اضافہ ہو گیا
ہاتھ وہ نزدیک دل کے لائے لا کر رہ گئے

تنگ تھا جس کیلئے حرف و بیاں کا دائرہ
وہ فسانہ ہم خموشی میں سُنا کر رہ گئے

اُن پہ ہنسئے شوق سے جو مائل فریاد ہیں
اُن سے ڈریئے جو تم پر مُسکرا کر رہ گئے

آہ اُن تاروں کی خوں گشتہ تمنائے نمود
جو اُبھرتے ہی اُفق سے جھلملا کر رہ گئے

انتظار دوست میں شمعیں جلائیں رات بھر
شمعیں جب بجھنے لگیں آنسو بہا کر رہ گئے

خود پرستوں سے کہی حق بات جب کوئی اثر
ماننا تو اک طرف تیوری چڑھا کر رہ گئے

ٹپک پڑتے ہیں آنسو دل سے اُٹھتا ہے دُھواں اب تک
نہ جانے یاد کیوں آتی ہے بھولی داستاں اب تک

نوائے درد سے لبریز ہے سازِ فغاں اب تک
لبِ خاموش پر بسمل ہے آہِ ناتواں اب تک

کیا کرتا ہے افشا کیسے کیسے راز فطرت کے
مگر انساں نہیں فطرت کا اپنی رازداں اب تک

وفا کیسی یہاں احساس محرومی نہیں باقی،
خدا رکھے چلا جاتا ہے اُن کا امتحاں اب تک

رہ و رسم وفا و مہر ہے مسدود مدت سے
مگر ہیں آرزوئیں کارواں در کارواں اب تک

پیاپے انقلاب آئے ورق اُلٹا زمانے کا
مگر ہم ہیں کہ ہیں آسودۂ خوابِ گراں اب تک

چمن والو چمن کا تم کو نظارہ مبارک ہو
گھٹا ہے میری آنکھوں میں نشیمن کا دھواں اب تک

اثرؔ وہ جانبِ منزل بھلا کیا گامزن ہوں گے
جنھیں ہے پائے خواب آلودہ ہی سنگِ نشاں اب تک

شورشِ عشق کا جو تھا وہی عنواں ہے ابھی
دشنۂ ناز خلش ریزِ رگِ جاں ہے ابھی

دل کے ہر داغ میں اک شعلہ فروزاں ہے ابھی
آئنہ بندیٔ گلزار کا ساماں ہے ابھی

موجۂ گل ہو سحر ہو کہ دلِ صدپارہ
عشق اک سلسلۂ چاک گریباں ہے ابھی

دیکھیے وہ بھی جو رہ جائے سحر ہونے تک
ایک دھندلا سا جو تارا سرِ مژگاں ہو ابھی

تیرے قربان نہ کر فکرِ مداوا کچھ دیر
دردِ لذت کشِ محرومیِ درماں ہے ابھی

اے مرے ڈوبتے دل آس بندھی رہنے دے
بھولنے والے کو یاد آنے کا امکاں ہے ابھی

قیدِ صیاد میں ہر چند زمانہ گزرا
ہر نفس جانبِ گلزار پر افشاں ہو ابھی

مادیت کا پرستار یہ مغرورِ انساں
اس قدر جاننے پر اپنے سے پنہاں ہے ابھی

گرمیِ جہد سے کر تازہ گلستاں تعمیر
زندگی تیری فقط شعلۂ رقصاں ہو ابھی

عشق رسوائے جنوں اور یہ عالم کہ اثر
چاک دامن سے الگ چاک گریباں ہو ابھی

جہاں ہو ظلمت کا دور دورہ یہ وہم ہے روشنی ملے گی
فضائیں نکھری ہوئی ملیں گی نظر کو بالیدگی ملے گی

عزیز جب ہو گا باغباں کو چمن کا ہر گل ہر آشیانہ
عروسِ نو کا گمان ہو گا بہار ایسی سجی ملے گی

جہاں ہوئی ہے زمیں شفق گوں بہا ہے انساں کا خون اتنا
ہم اخوت کا ہو جو پیماں تو بانہیں کھولے خوشی ملے گی

ضمیرِ شب سے طلوع ہو گا اک آفتابِ نظامِ تازہ
نئی نویلی سحر کی کرنوں سے کھیلتی زندگی ملے گی

کہے نہ جاؤ یہ ہو کے نومید حاصلِ جہد کچھ نہیں ہے
خلوصِ نیت سے کام ہو گا تو داد دشمن سے بھی ملے گی

جو نیکیاں ہیں شکستِ خوردہ تو سرنگوں راستی کا پرچم
یہی ہے نقشہ تو آدمیت کفن میں لپٹی ہوئی ملے گی

ڈراؤنی کالی کالی راتیں مہیب خوابوں سے جو بسی ہیں
یہی ہیں وہ مرحلے کہ جن سے گزرنے پر زندگی ملے گی

جدید تہذیب کیا بلا ہے جو پوچھتے ہو اثر تو سُن لو
ہوس کے حلقے میں نیم عُریاں بہیمیت ناچتی ملے گی

یہیں تک بس رسائی عقل کی معلوم ہوتی ہے
کہ ہر شے میں کسی شے کی کمی معلوم ہوتی ہے

کہاں وہ بات جو پائی گئی تیرے تبسم میں
کلی بھی آدھ کھلی یوں تو بھلی معلوم ہوتی ہے

پلک تک اشک آتا تھا مگر جب سے نہیں آتا
نظر میں ایک بجلی کوندتی معلوم ہوتی ہے

یقیں کی منزلیں شبہات ہی کے بعد آتی ہیں
حقیقت پہلے اک چھاؤں سی معلوم ہوتی ہے

ابھی تو گھٹنیوں چلنا ابھی انساں نے نہیں سیکھا
ابھی سے کس لئے فطرت تھکی معلوم ہوتی ہے

بھلا وہ رہ نوردِ منزلِ مقصود کیا ہوگا
کفن بر دوش جس کو زندگی معلوم ہوتی ہے

اثر حُسنِ نظر شامل جو ہو ذوقِ تماشا میں
نہ ہوتے بھی نئی دنیا نئی معلوم ہوتی ہے

نہ ہم اپنے نہ دل اپنا نہ وہ آرامِ جاں اپنا
فسانہ ہو گیا دورِ نشاطِ کامراں اپنا

سپردِ خامشی اثر کیا ذوقِ فغاں اپنا
لیا کرتے ہیں اہلِ درد یوں بھی امتحاں اپنا

جہاں دیکھا کہ اب کچھ مطمئن ہے بدگماں اپنا
معاً بدلا وہیں سے ہم نے رنگِ داستاں اپنا

ہمارے راستے میں کہکشاں آنکھیں بچھاتی تھی | مہ و انجم کا اک دن ہمسفر تھا کارواں اپنا
خدایا کیا وہی ہم ہیں جو اک دن عہد مستی میں | سمجھتے موت کو تھے ہر مہم میں پاسباں اپنا
قیامت ہے کہ داغ شرم سے بھی آج بدتر ہے | ستاروں پر جو چمکا تھا ان سجدوں کا نشاں اپنا

برنگ بوئے گل آوارگی بھی حسن رکھتی ہے
اثر منزل سے بیگانہ ہی اچھا کارواں اپنا

محبت میں اسی کا نام ہے کچھ کام کر جانا | کسی کے واسطے جینا نہ جی سکنا تو مر جانا
جدھر دل اُٹھے اُس جانب بلا خوف و خطر جانا | یہاں جس نے یہ جانا اُس نے جینے کا ہنر جانا
برنگ نکہت سرخوش پسند آوارگی آئی | تجسس میں ترے ہم نے نہ گھر جانا نہ در جانا
زبان عشق و مستی میں اسی کا نام ہستی ہے | جہانِ رنگ و بو سے ایک لغزش میں گزر جانا
لباس تازہ میں فطرت دوبارہ جلوہ گر ہوگی | فنا کو جس نے یوں سمجھا بقائے خوب تر جانا
برنگ شعلہ افسردہ گرمی جس میں باقی ہے | شکست پر کو بھی تحریک پرواز دگر جانا
نہ اتنا بھی کوئی سرگشتہ آزار ہو جائے | کہ درد سر نہ ہونے کو بھی اکثر درد سر جانا
ادب آموز حرماں ہوں کسی منعم سے کیا مطلب | متاع درد کو گنجینۂ لعل و گہر جانا
کسی کی بزم سے اُٹھنا یہ کہہ کر اب نہ آئیں گے | دل ناشاد سے مجبور ہو ہو کر مگر جانا
یہ ممکن ہی نہ تھا تو دل دکھاتا اس نزاکت سے | پشیماں ہوں کہ تجھ کو درد دل سے بے خبر جانا
خدا کی گر نہیں خلق خدا کی اس نے خدمت کی | یہاں مذہب کو جس نے ماورائے خیر و شر جانا
ہجوم تیرہ بختی میں اثر بس ہوش اتنا تھا | کہ مثل داغ لالہ شام غم کو بے سحر جانا

خوشی ہم اپنے دل زار کی نہیں کرتے
کسی سے عرض تمنا کبھی نہیں کرتے

اداشناس تری خوئے بے نیازی کے
بلند وپست کی تفریق ہی نہیں کرتے

دوروزہ زندگی مستعار ہے لیکن
شگفتگی میں گُل تر کبھی نہیں کرتے

پڑا ہے سابقہ ہم کو انھیں سے یا قسمت
سوائے جور کے جو دلدہی نہیں کرتے

کبھی جو ذکر وفا کیجئے تو کہتا ہے
وفاشعار یہ باتیں کبھی نہیں کرتے

خدا کی شان وہ سمجھیں ذلیل و خوار ہمیں
جو لوگ اپنی ہی عزت ابھی نہیں کرتے

مزاج عشق میں جن کو ہے دخل کچھ بھی اثر
کسی کی دل کے سوا پیروی نہیں کرتے

لاکھ صدمے اُٹھائیں گے ہم لوگ
مُسکراتے ہی جائیں گے ہم لوگ

تجھ کو خاطر میں اے غم دوراں
لائے ہیں اور نہ لائیں گے ہم لوگ

جان جائے گی جائے بات رہے
سر نہ ہرگز جُھکائیں گے ہم لوگ

بغض و نفرت سے دور کوسوں دور
اپنی دنیا بسائیں گے ہم لوگ

جب رہے گا نہ آسرا کوئی
عید اُس دن منائیں گے ہم لوگ

دل ہمارا دُکھا ہوا ہے بہت
دل بھلا کیا دکھائیں گے ہم لوگ

تابقدر غیر حق سے اثر
اپنا دامن بچائیں گے ہم لوگ

بقدر ہوش ہے غفلت کسی کو کیا معلوم
بشر کی حد جہالت کسی کو کیا معلوم

حباب دیکھ لیا آبگینہ دیکھ لیا
شکستِ دل کی نزاکت کسی کو کیا معلوم

نشاطِ جوشِ نکہت کی ہے خبر سب کو
تباہ کاریٔ نکہت کسی کو کیا معلوم

جو آنکھ سے کسی مظلوم کی ٹپکتا ہے
اُس اشکِ غم کی سرایت کسی کو کیا معلوم

خیال جس میں ہے پرتو جمال کا تیرے
اس اک خیال کی رفعت کسی کو کیا معلوم

مجھے سُنا کے یہ کہتا ہے دیکھنا شوخی
کسے ہے کس سے محبت کسی کو کیا معلوم

جب اپنے نفس پر انسان فتح پاتا ہے
جو گیت گاتی ہے فطرت کسی کو کیا معلوم

نیازِ عشق کی ایسی بھی ایک منزل ہے
جہاں ہے شکر شکایت کسی کو کیا معلوم

مجھے خود اپنی محبت سے اب محبت ہے
یہ لطفِ شانِ رقابت کسی کو کیا معلوم

غزل کو نام تو رکھتے ہیں آپ اثر لیکن
ردیف دیکھئے حضرت "کسی کو کیا معلوم"

گلشن میں جب کہیں کوئی جائے اماں نہ ہو
پھر کیوں بہار اپنی نظر میں خزاں نہ ہو

جو بات لب پہ آئے وہ فریاد بن کے آئے
اب اس قدر بھی ہم سے کوئی سرگراں نہ ہو

اب دل کو چین لینے نہیں دیتی یہ خلش
ضبطِ فغاں پہ ترکِ فغاں کا گماں نہ ہو

ہم قید سے رہا جو ہوئے بھی تو کیا ہوئے
جب گوشۂ چمن میں نصیبِ آشیاں نہ ہو

اس لمحۂ سکوت کی اُف سوگواریاں
فطرت تو مسکراتی ہو دل شادماں نہ ہو

تاروں کی روشنی ہے یہ شبہائے تار میں
یا نغمہ جس میں دخلِ زبان و بیاں نہ ہو

زندانِ تنگ و تار سے کیا نکلے زندگی
تابانیوں کی اپنی ہی جب رازداں نہ ہو

سوتے جو پھوٹیں روح کی گہرائی سے اثرؔ
کیوں موج موج شعر سے نغمہ رواں نہ ہو

اک بیوفا کو ہم نے جس وقت دل دیا تھا
غنچے نے گوش گل میں چپکے سے کچھ کہا تھا

میں تیری سمت دیکھوں اور آنکھ بھر کے دیکھوں
حیران ہوں میں خود بھی کیا مجھ کو ہو گیا تھا

کیا درد دل وہ سنتا اُس کا تو بے سُنے ہی
اک رنگ آ رہا تھا اک رنگ جا رہا تھا

رخصت کیا اُسے بھی اک آہ سرد بھر کر
دھندلا سا داغ حسرت جو دل میں رہ گیا تھا

اب حال زار اُس سے کہنے کی آرزو ہے
پرسش پہ جس کی اک دن ہم نے گلہ کیا تھا

بلبل غریب سمجھی لیکن قفس میں سمجھی
جس دام میں پھنسی تھی پھولوں ہی کا بنا تھا

دشت طلب اثرؔ تھا اور شوق بے نہایت
آئینہ دار منزل ایک ایک نقش پا تھا

۱۹۵۱ء

شوق بے سروپا کا اب یہ سازو ساماں ہے
خار خار ناکامی گل فروش حرماں ہے

آہ کہ ختم ہوتی ہیں انتظار کی گھڑیاں
رنگ شب پریدہ ہے صبر پابجولاں ہے

چھوٹ پڑ گئی شاید تیرے لعل خنداں کی
داغ سینۂ لالہ شعلہ در گریباں ہے

نالہ دم بخود ہو کر اور بھی رسا ہوگا
خامشی کے سینے میں دفن اک نیستاں ہے

خیر ہو تری اے دل کچھ سبب نہیں کھلتا
آج کھویا کھویا سا حسن فتنہ ساماں ہے

ضبط سے کہو رخصت، وقت ہے تڑپنے کا
دل کے خون ہونے پر انحصار درماں ہے

تازہ فتنہ برپا کر حسن خود نما کوئی
پھر نمود پر مائل عشق خانہ ویراں ہے

شکوہ نارسائی کا ہوئے گا اب تک تو
راہبر سوئے منزل الغرض فراواں ہے

وہم کی پرستاری دیکھنے نہیں دیتی
ورنہ ایک اک ذرہ جلوہ زار عرفاں ہے

عشق کی وہ منزل ہے میرزا اثر جس میں
دین ہے نہ دنیا ہے کفر ہے نہ ایماں ہے

بیگانگی کی تم سے شکایت نہیں مجھے
معلوم خود بھی اپنی حقیقت نہیں مجھے

جب سے ہوا ہوں دردِ محبت کا رازداں
ہے کون غم جو وجہ مسرت نہیں مجھے

مارا ہوا ہوں دیدۂ عبرت شناس کا
پروائے رنج و خواہش راحت نہیں مجھے

میں شکوہ سنج ہوں ستم روزگار کا
تم سے خدا نہ کردہ شکایت نہیں مجھے

مطلب سمجھ گیا نگہِ التفات کا
پر کیا کروں کہ آہ کی طاقت نہیں مجھے

آئینۂ خیال میں ہے جلوہ گر کوئی
ہنگامہ ہائے شوق کی فرصت نہیں مجھے

کیا جانے کس لحاظ سے خاموش ہوں اثر
اندیشۂ زبونیٔ ہمت نہیں مجھے

اے یاد چمن کیا اس کے سوا ہم سوختہ ساماں دیکھیں گے
غنچے کی طرح دامن میں کبھی اپنا ہی گریباں دیکھیں گے

اترے ہوئے چہرے پھولوں کے بکھری ہوئی کلیاں خشک شجر
یہ کیا تھی خبر ایسا بھی بہار ایسا بھی گلستاں دیکھیں گے

"اول کو ہے نسبت آخر سے" اس قول میں ہے سچائی اگر
اک خواب پریشاں دیکھ چکے، اک خواب پریشاں دیکھیں گے

پر پیچ تھیں راہیں گم رہبر کھٹکا تھا یہی دھڑکا تھا یہی
سرگرمیٔ شوق منزل کو محمل کش حرماں دیکھیں گے

تم لاکھ قسم کھاؤ لیکن چتون کی لگاوٹ کہتی ہے،
وعدہ تو وفا ہونے سے رہا وعدے سے پشیماں دیکھیں گے

اشکوں کا امڈنا ختم ہوا پھر بھی یہ تقاضا غم کا ہے
مژگاں پہ نہیں تو سینے میں داغوں سے چراغاں دیکھیں گے

پھولوں سے مقابل کر کے تمھیں پھولوں میں چھپا کے بعد ازاں
افسوس ہے تمھارے تبسم کا یا جوشِ بہاراں دیکھیں گے

جو آگ سے کھیلا کرتے ہیں یہ قول اثرؔ کا سن رکھیں
خود جس میں ہوں جل کر خاکستر وہ شعلے فروزاں دیکھیں گے

تری نگاہ نے کیا کہہ دیا خدا جانے — تمام ہوش کی باتیں ہیں اور دیوانے
جنوں کی ختم ہوئی بھی جو دشت پیمائی — تصورات میں ڈھلتے رہیں گے ویرانے
اب اس کے بعد بھی کیا اور کوئی منزل ہے — حضورِ شمع میں بیتاب کیوں ہیں پروانے
ابھی خیال کو سرشاریوں کی حاجت ہے — ابھی خیال کے چھلکے نہیں ہیں پیمانے
دلِ خراب یہ ضد تو نے کیا نکالی ہے — کہ مدعا کوئی بے عرض مدعا جانے
غرورِ حسن اجازت جو دے تو مجھ سے سن — تری نگاہ کہا کرتی ہے جو افسانے
کھلے ہوئے ہیں جہاں جاؤ جس طرف دیکھو — بجائے رندی و پاکی ہوس کے میخانے
ہوس پرست سے مطلب نہیں جو عاشق ہیں — خود اپنی لغزشِ مستانہ کے ہیں دیوانے
فرار ہو گئی جیسے نگاہ سے شوخی — نہ جانے کہہ دیا کیا اُن سے شوقِ رسوا نے
جو تم کہو تو وہ بیداریوں کی خاطر ہیں — جو ہم کہیں تو سلانے کو ہیں وہ افسانے

قدم زمیں پہ جو رکھتے نہ تھے رعونت سے — وہ دربدر کی لگے آج ٹھوکریں کھانے

اثر زباں سے کیا اُن کی ترجمانی ہو
نگاہ میں جو بسے ہیں لطیف افسانے

اک شرارہ پریدہ کے مانند — دل ہے صیدِ رمیدہ کے مانند
شوق اپنا ہے ناتمام ابھی — بادۂ نارسیدہ کے مانند
جلوہ گر ہے کوئی تصور میں — صبح تازہ دمیدہ کے مانند
نظر آیا نہ دوسرا صیاد — عشوۂ دام چیدہ کے مانند
مقصدِ زیست گو مگو ہی رہا — کاغذ "آب دیدہ" کے مانند
وطن آوارہ ہیں وطن میں ہم — نالۂ ناشنیدہ کے مانند
دل میں بسمل ہیں خواہشیں دل کی — خرمنِ برق چیدہ کے مانند

رائگاں اپنی محنتیں ہیں اثر
خرمنِ دیر چیدہ کے مانند

ترے در کے جب سے گدا ہوگئے ہم — بڑے خود نما خود ستا ہوگئے ہم
نشاطِ ابد ماجرا ہوگئے ہم — نوا سنجِ ذوقِ فنا ہوگئے ہم
محبت میں تیری گرفتار ہوکر — ہر اک رنج و غم سے رہا ہوگئے ہم
تری زلفِ برہم کا سودا مبارک — اُسی کی پریشاں ادا ہوگئے ہم
نہ پایا کوئی قدرداں جب وفا کا — خود اپنی وفا پر فدا ہوگئے ہم

محبت میں ایسا بھی اک وقت آیا — نظر اس نے پھیری خفا ہو گئے ہم
کرم پر بھی ہوتا ہے دھوکا ستم کا — یہاں تک الم آشنا ہو گئے ہم
رہی بیکسی میں بھی اتنی تو غیرت — جو شل ہو وہ دستِ دعا ہو گئے ہم
حیا جس کو رخصت نہ دے التجا کی — نگاہوں کی وہ التجا ہو گئے ہم

اثر اُس کی پُرسش پہ جانے ہوا کیا
صدائے دلِ بے نوا ہو گئے

۱۹۵۲ء

سر جھکا کر کچھ کہا شرما گئے / دل وہی کو آئے تھے تڑپا گئے
جرم ٹھہرا ہے وفا کا ذکر بھی / ہم سزا اپنے کئے کی پا گئے
میکدہ جنت ہی اتنی بات تھی / جس کو واعظ طول سے فرما گئے
جستجو میں نکہتیں آوارہ ہیں / ہو نہ ہو گل تیری سن گن پا گئے
دیکھ لے اپنا چمن اے باغباں / ہم بھی کچھ دیر آ کے دل بہلا گئے

اک وفا بیزار کے آگے اثرؔ
خود بخود شکوے زباں پر آ گئے

کچھ نشیمن تو گلوں سے چھا گئے / اور کچھ بجلی کی زد میں آ گئے
آپ کی باتیں ہیں اُس کا مشغلہ / آپ باتوں میں جسے بہلا گئے
منزل عشق اب نگاہوں سے ہو طے / پاؤں تو اس راہ میں تھرا گئے
مجلسوں میں بجلیاں حل ہو گئیں / ناگہاں وہ دل جہاں ٹکرا گئے
آنے والے آ کہاں تک انتظار / چاند ڈوبا تارے بھی کجلا گئے

مدرسے تک ہی تھیں بحث آرائیاں چپ لگی جب بات کی تہ پا گئے

سعیٔ ضبط اشک کے باوصف اثر
چند افسانے مژہ تک آگئے

شاہدِ گلعذار ارے توبہ روکشِ صد بہار ارے توبہ
جیسے نرگس کی ادھ کھلی ہو کلی دیدۂ پُر خمار ارے توبہ
نگہِ شوخ اُف معاذ اللہ اک لپکتا شرار ارے توبہ
وہ جوانی کہ خود جوانی کو جس پہ آجائے پیار ارے توبہ
سنگدل ہوتے ناز نہیں ایسا کہ نگہِ رُخ پہ بار ارے توبہ
آبشار اک سیاہ بجلی کا گیسوئے تابدار ارے توبہ
وہ تکلم کہ جام سے چھلکے بادۂ خوش گوار ارے توبہ
ایک تو وعدے کی فسوں کاری پھر دل بے قرار ارے توبہ
کاہشِ انتظار میں شامل لذتِ انتظار ارے توبہ
سامنا بھی جو بے وفا کا ہوا گزرا بیگانہ وار ارے توبہ

دل نہیں اب اثر ہے پہلو میں
حسرتوں کا مزار ارے توبہ

حسرت ہے نگاہ ناز کا بھی نازک سا اشارا ہو جائے
مشتاق تماشا آنکھوں کو جب تیر انظارا ہو جائے

اس عشق تمنا کشتہ کا شاید یوں ہیں چارا ہو جائے
اب تک جو گوارا ہو نہ سکا اب وہ بھی گوارا ہو جائے

ہم نے تو بہت کی اپنی سی اب کوئی تمھیں تدبیر کرو
بے منت شور تشنہ لبی الفت میں گزارا ہو جائے

اک موج نشاط بے پایاں آغوش کشا ہے تیرے لئے
برداشت کر ایسی طوفاں کی طوفاں ہی کنارا ہو جائے

اے اشک ٹھہر مژگاں پہ ذرا ہنگام سحر بھی دور نہیں
مٹی میں نہ مل یہ ممکن ہے تو صبح کا تارا ہو جائے

ہم عشق کے بندوں کی خاطر یہ حسن تلافی کافی ہے
جو دل کو دکھا کر عذر کرے کیوں اور نہ پیارا ہو جائے

جو رمز شناس خزاں کا نہیں وہ خاک بہاریں لوٹے گا
یہ بیخبری اس پر یہ ہوس گلشن کا اجارا ہو جائے

تم روتے ہو بیٹھے راحت کو اور عشق کا یہ حاصل ہے اثر
خود نیش میں لذت نوش کی ہو ہر تلخ گوارا ہو جائے

ماضی کی طرف دیکھ نہ فردا پہ نظر کر — اک معرکۂ سخت ہے امروز اسے سر کر
شکوۂ بے مہریٔ ایام کہاں تک — اٹھ اور شب تار کو ہمرنگ سحر کر

آزاد ہو دم بھر کے لئے قید خرد سے
دل ہو ترے پہلو میں سوئے دل بھی نظر کر

کیا غم جو ہے موجوں کے تھپیڑوں میں سفینہ
ساحل کی خوشی بڑھتی ہے طوفاں سے گزر کر

آرائشِ مژگاں کے لئے اشک بہت ہیں
اک دشنۂ سر تیز بھی پیوست جگر کر

اس طرح تری یاد مرے دل میں بسی ہے
جیسے کہ دلہن حجرے میں بیٹھی ہو سنور کر

اب ہو یہ اثر عشق کی غیرت کا تقاضا
بن جائے اگر جان پہ بھی آنکھ نہ تر کر

بھولے افسانے وفا کے یاد دلواتے ہوئے
تم تو آئے اور دل کی آگ بھڑکاتے ہوئے

موجِ مے بل کھا گئی گل کو جماہی آگئی
زلف کو دیکھا جو اُس عارض پہ لہراتے ہوئے

بے مروت یاد کر لے اب تو مدت ہو گئی
تیری باتوں سے دلِ مضطر کو بہلاتے ہوئے

نیند سے اٹھ کر کسی نے اس طرح آنکھیں ملیں
صبح کے تارے کو دیکھا آنکھ جھپکاتے ہوئے

کیا خرامِ ناز پر غش ہے فقط بادِ بہار
نکہتِ گل کو بھی دیکھا ٹھوکریں کھاتے ہوئے

ہم اُٹھے جاتے تو ہیں لیکن بتا دے بےقدر
کس کے در کی خاک چھانیں تیرے کہلاتے ہوئے

جھاڑ کر دامن اثر جس بزم سے اٹھ آئے تھے
آج پھر دیکھے گئے حضرت اُدھر جاتے ہوئے

سنہ ۱۹۵۳ء

چپکے سے نام لے کے تمہارا کبھی کبھی
دل ڈوبنے لگا تو ابھارا کبھی کبھی

عہدِ فراق یوں بھی گزارا کبھی کبھی
زلفِ عروسِ غم کو سنوارا کبھی کبھی

ڈھونڈا ہے بیکسی کا سہارا کبھی کبھی
یہ جبر بھی کیا ہے گوارا کبھی کبھی

میں نے تو ہونٹ سی لئے اس دل کو کیا کروں
بے اختیار تم کو پکارا کبھی کبھی

صرف اس لئے کہ دل شکنی ہو نہ دوست کی
احسان کر لیا ہے گوارا کبھی کبھی

رسوائیوں سے دور نہیں بے قراریاں
دل کو ہو کاش صبر کا یارا کبھی کبھی

ساقی نہ دے شراب مگر چشمِ مست کا
کوئی تو اس طرف بھی اشارا کبھی کبھی

کترا کے ایک موج یہ کہتی نکل گئی
ساحل سے مصلحت ہے کنارا کبھی کبھی

اے شاہدِ جمال کوئی شکل ہے کہ ہو
تیری نظر سے تیرا نظارا کبھی کبھی

موجوں سے چھینٹے کھیلے ہیں منجدھار میں بھی ہم
طوفان کو ہے پار اتارا کبھی کبھی

کھایا ہے زخم زخم پہ ہنس ہنس کے بار بار
ہے چوٹ ہی سے چوٹ کو دھارا کبھی کبھی

ہنگامِ گریہ آہ سے نادان اثر حمد
اڑتا ہے اشک جیسے شرارا کبھی کبھی

بیگانہ ہو کے لذّتِ آہِ سحر سے ہم
مینائے شوق بھرتے ہیں خونِ جگر سے ہم

رحمت کرے قبول تو ہے واسطہ قبول
رکھتے ہیں دور اپنی دعا کو اثر سے ہم

شاید کھُلے کہ حُسن ہے کیا اور عشق کیا
اے کاش تجھ کو دیکھ لیں تیری نظر سے ہم

مثلِ نسیم بے سر و پا تیرے شوق میں
مستانہ وار گزرے ہر اک رہگزر سے ہم

اس التفاتِ خاص کے قربان جائیے
کھوئے ہوئے سے وہ ہیں تو کچھ بے خبر سے ہم

شاید یہی مآل ہے تیری تلاش کا
چھپتے چلے ہی جاتے ہیں اپنی نظر سے ہم

بڑھتا ہے درد کاوشِ درماں کے ساتھ ساتھ
دل چاہتا ہے شکوہ کریں چارہ گر سے ہم

اس سے تو ڈوبنا کہیں بہتر ہے ناخدا
خاشاک بن کے گزرے جو موجِ خطر سے ہم

جوشِ جنوں کا اب یہ تقاضا ہے چھین لیں
شبنم سے تکمہ اور گریباں سحر سے ہم

جو کچھ تری حیا کہے لیکن خطا معاف
جو کام ہے نظر کا نہ کیوں لیں نظر سے ہم

اس بے وفا کو یاد بھی ہو وعدہ یا نہیں
لینے لگے ہیں فالِ اثر بام و در سے ہم

آزاد ہو کے دامِ گہِ خیر و شر سے ہم
درسِ نشاط لیتے ہیں گُلہائے تر سے ہم

آئینہ بن گئے ہیں کسی کے جمال کا
حیرت فروشِ نگہِ خود نگر سے ہم

بڑھتا ہے ذوقِ دید نظارے کے ساتھ ساتھ
حیران ہیں خود اپنے فروغِ نظر سے ہم

کیا پوچھنا دماغ کا ہے عرش کے اُدھر
کونین لوٹ لائے ہیں اُس رہگزر سے ہم

اک برق چمکی اور جگر میں اُتر گئی
دل کو بچائے تھے نگہِ فتنہ گر سے ہم

آیا جو وقت سو گئے یا تھا یہ ولولہ — دنیا نئی بسائیں گے تازہ سحر سے ہم
ناکام و نامراد بھٹکتے ہیں چار سو — منزل سے دور چھوٹ گئے راہبر سے ہم
عرض ہنر کے نام سے آنے لگی حیا — نادم ہوئے ہیں اتنے تو عرض ہنر سے ہم

دنیا ہزار کچھ کہے پروا نہیں اثرؔ
اے وائے گر گئے اپنی نظر سے ہم

کیا جانے اب کے بچھڑے ملیں گے کبھی یا نہیں — ہاں ہاں حیا کرو مگر اتنی حیا نہیں
راز حیات و مرگ کا وہ آشنا نہیں — جس پر مذاق درد کا نشا کھلا نہیں
اس زندگی سے موت بھلی ہے ہزار بار — جیتے ہیں اور جینے کا کچھ مدعا نہیں
کتنے ہی مرحلوں سے گزرنے کے باوجود — انسان خود شناس کہ خود آشنا نہیں
آشوب گاہ شوق میں دل کہتے ہیں جسے — جو نالہ نارسا ہے وہی نارسا نہیں
صورت کوئی منانے کی نکلے تو کس طرح — وہ شوخ یوں خفا ہے کہ جیسے خفا نہیں
دل کے بھی ساتھ ساتھ ہی مانند بوئے گل — وہ قافلہ کہ جس میں جرس کی صدا نہیں
تیرے سوا کسی سے غرض ہے نہ مدعا — تیرے سوا کسی کا مجھے آسرا نہیں

ہے اک حقیقت آج بھی یہ قول میرؔ اثرؔ
”صد کاروان وفا ہے کوئی پوچھتا نہیں“

جو آرزو نہ ہو تیری تو آرزو کیا ہے — جو تیرے ذکر سے خالی ہو گفتگو کیا ہے
اگر نصیب نہیں ہے گداز شبنم کا — یہ شست و شو جسے کہتے ہیں سب وضو کیا ہے

نظر نظر سے ملے حال دل عیاں ہو جائے
زباں کا دخل جو ہو لطف گفتگو کیا ہے

خرد نے کیں تو بہت موشگافیاں نہ کھلا
فنا کے پردے میں یہ جوشش نمو کیا ہے

اُسی کی جلوہ گہِ ناز جب ہے کُل عالم
فریب شوق نہیں ہے تو جستجو کیا ہے

تم اُس کے دوست بنو جب تو کیوں نہ اترائے
وگرنہ کیا ہے عدو ہستیٔ عدو کیا ہے

چمن کی سیر بہت کی یہ راز راز رہا
بہار کیا ہے خزاں کیا ہے رنگ و بو کیا ہے

ستم ظریف نے پوچھا اثرؔ تو یوں پوچھا
یہ اشک ہو تری مژگاں پہ یا لہو کیا ہے

جب تک لہو میں دل کا سفینہ رواں نہ تھا
گریہ حریف لذت ضبط فغاں نہ تھا

تم گشتۂ بہار ہو میری نگاہ میں
برباد نکہتیں تھیں جو دورِ خزاں نہ تھا

کہتے ہو دل کا حال نہ کیوں اُس سے کہہ دیا
کیا دل کا حال بے کہے اُس پر عیاں نہ تھا

اُس سے ہمیشہ دور رہی منزل مراد
گم اپنی ہی تلاش میں جو کارواں نہ تھا

تعمیر تھی ہمارے ہی وہم و خیال کی
اس سرزمیں پہ تیرا کہیں آستاں نہ تھا

جب تک دلوں میں درد محبت تھا جاگزیں
یہ رنگ تیرہ روزیٔ اہل جہاں نہ تھا

یہ بھی فریب شوق تمنا نواز کا
پیش نظر تھا پیش نظر جو یہاں نہ تھا

وہ بھی زمانہ یاد ہے کیوں میرزا اثرؔ
رسوائیوں کا آپ کی چرچا کہاں نہ تھا

عاشقی نشۂ سرشار ہوئی جاتی ہے
زندگی لغزش میخوار ہوئی جاتی ہے

جتنی راحت کی طلبگار ہوئی جاتی ہے
زیست اک پیکر آزار ہوئی جاتی ہے

کس طرح تیری محبت کو چھپائے رکھئے
خامشی بھی لب اظہار ہوئی جاتی ہے

آہ وہ زیست کہ نغمے تو ابلنا کیسے
ٹوٹے اک ساز کی جھنکار ہوئی جاتی ہے

نیند میں تجھکو جو ملتے ہوئے آنکھیں دیکھیں
ہر کلی دیدۂ بیدار ہوئی جاتی ہے

شفقت وہ جو ہوا دل نہیں اب قابو میں
جیت اس معرکے میں ہار ہوئی جاتی ہے

اس قدر رنگ میں ڈوبی ہوئی آئی ہے بہار
کہ نظر آپ ہی گلبار ہوئی جاتی ہے

پرسش دوست گوارا نہیں اللہ اللہ
کیا یہ حالت دل بیمار ہوئی جاتی ہے

جہد جاری رہے بد دل نہ ہو اے مرد خدا
کچھ نہ کچھ راہ تو ہموار ہوئی جاتی ہے

عصر نو کیا یوہیں تعمیر کیا کرتے ہیں
صبح ہمرنگ شب تار ہوئی جاتی ہے

•

آئی بہار تو بھی ساغر کشاں چلا آ
گل میں ہے جوشش بادہ تا گلستاں چلا آ

دیتی ہے کام اب تک میری زباں چلا آ
کیا کیا ہیں آرزوئیں کر دوں بیاں چلا آ

اس بیقرار دل کو یکساں ہے یہ بھی وہ بھی
نامہرباں چلا آ، یا مہرباں چلا آ

خود دیکھ لے کہ دل میں ترے سوا کوئی ہے
دم بھر کے واسطے ہی او بدگماں چلا آ

پرکیف ہیں فضائیں سرشار ہیں فضائیں
رعنائیاں بڑھاتا اے کام جاں چلا آ

ایسی حیا اگر ہے تیری حیا کے صدقے
بکھرائے رخ پہ زلف عنبر فشاں چلا آ

تاریکیوں میں گھر کر کب سے بھٹک رہا ہوں
اے نور صبح گاہی پھر ناگہاں چلا آ

دردِ زباں رہے گا پیہم اثرؔ کا مصرعہ
"آئی بہار تو بھی دامن کشاں چلا آ"

کون ہوا زمزمہ زن سازِ دل — اور ہی کچھ آج ہے اندازِ دل
عیش دو عالم سے ہوا بے نیاز — آئینہ جس پر بھی ہوا رازِ دل
سوختہ جانی کا اثر دیکھنا — آہ کا شعلہ ہے چمن سازِ دل
خندۂ بیباک ترا یاد ہے — اب نہ صدا دیگا کبھی سازِ دل
وقت ہے اک طائرِ بے آشیاں — دیکھے کوئی رفعتِ پروازِ دل
اب کوئی حسرت ہے نہ ارمان ہے — کون ہوا خانہ برانداز دل

کس سے گلہ کیجئے کس کا اثرؔ
اپنی تباہی پہ ہو جب نازِ دل

تیرے دیوانے کا انداز پریشاں دیکھا — کبھی حیراں کبھی خنداں کبھی گریاں دیکھا
دیدۂ انجم و گل خواب سے بیگانہ ہوئے — ناز سے تجکو جو برہمزن مژگاں دیکھا
رہگزر جس میں نقش قدم تیرے پائے گئے — ذرے ذرے کو وہاں آئینہ ساماں دیکھا
اب نہ وہ جوش تمنا ہے نہ وہ شورِ طلب — کچھ بتا تو سہی کیا دیدۂ حیراں دیکھا
کس قدر عشق کے آزار میں لذت ہے نہ پوچھ — جس کو دیکھا اُسے بیگانۂ درماں دیکھا
اب کی وحشت ہی میں کل فصل بہاری گذری — گل کا دامن تو کبھی اپنا گریباں دیکھا
چشم عبرت سے نظر کی جو سوئے بزم جہاں — نالہ و نغمہ کو آہنگ میں یکساں دیکھا

مہر کی تجھ سے توقع تھی یہ ہو اُسکی سزا　　کہ محبت کو محبت سے پشیماں دیکھا

جو بظاہر تھی نگاہ غلط انداز اثرؔ
ایک پیکاں تھا کہ پیوست رگ جاں دیکھا

ساغر اُٹھالیا کبھی مینا اُٹھالیا　　توبہ جو یاد آگئی رکھا اُٹھا لیا
لاتا ہے روز جان پر آفت نئی نئی　　جا تجھ سے ہاتھ اے دلِ شیدا اُٹھالیا
مثل نسیم پھر نہ لیا اک جگہ قرار　　جس نے تری تلاش کا بیڑا اُٹھالیا
لذت حیات کی بھی گئی دردِ دل کے ساتھ　　پچھتا رہا ہوں نازِ مسیحا اُٹھالیا
آسودگان خاک سے یہ بدگمانیاں　　دامن زمیں پہ لوٹ رہا تھا اُٹھالیا
اب اشکِ غم کھٹکتے ہیں آنکھوں میں اس طرح　　گویا پلک سے ریزۂ مینا اُٹھالیا

کیا کیا ستم گزر گئے جانِ غیور پر
احسان اثرؔ جو ہم نے کسی کا اُٹھالیا

سنہ ۱۹۵۴ء

پھرا ہے تیری جستجو میں اک جہاں کہاں کہاں
نظر پڑے ہیں نقش پائے رہرواں کہاں کہاں

طلب کے بعد ترک جب حصول پر ہو اختیار
نیاز عشق کا ہوا ہے امتحاں کہاں کہاں

جہاں میں قدرداں ملا نہ کوئی دردِ عشق کا
لئے پھرا ہوں یہ متاعِ رائگاں کہاں کہاں

کسی کے التفات پر کہ ایک ادھوری بات پر
رُکی ہے یک بیک مری زباں سکتہ خواں کہاں کہاں

جناب شیخ میکشوں میں آ رہے کہ خلد کی
ثنائے بادہ میں ہوئے ہیں گلفشاں کہاں کہاں

ہر ایک شاخ جھومتی ہے جیسے کوئی مست ہو
بہار میں بنائیے اب آشیاں کہاں کہاں

یہ محویت بھی ہوتی ہے کہ ان کا نام آتے ہی
زباں پہ اکثر آ گیا ہے "ناگہاں کہاں کہاں"

خدا کہو خدا کہا مگر نہ آئے راہ پر
ملائے جائیے بتوں کی ہاں میں ہاں کہاں کہاں

تری تلاش سے زیادہ تیری ٹوہ کے لئے
لگا کے لے گیا خیالِ بدگماں کہاں کہاں

وہ آستاں تو اک طرف نہ اُسکی رہگزر ملی
رواں دواں ستاروں کے ہیں کارواں کہاں کہاں

اثرؔ خموشیوں میں یا نگاہِ خیرہ خیرہ سے
کہی گئی ہے بیخودی کی داستاں کہاں کہاں

برق ہی جن کے نشیمن کے نگہبانوں میں
خندہ زن رہتے ہیں گھر گھر کے وہ طوفانوں میں

اب وہی پھرتے ہیں سرگشتہ بیابانوں میں
جن کی گلگشت تھی رنگین خیابانوں میں

درس ہی کوئی نہیں فرقہ پرستی کے سوا
تفرقہ ساز سیاست کے دبستانوں میں

کچھ بھی نفرت سے ملا ہے کبھی نفرت کے سوا
کیوں نہ ہوں خار ہی خار اپنے گلستانوں میں

کہیں اس حسن سے پھٹتا ہے گریباں کوئی
ہو نہ ہو گل ہیں ترے چاک گریبانوں میں

شاید آیا ہے کوئی وحشی آشفتہ مزاج
کہ بگولے ہیں سراسیمہ بیابانوں میں

جب ہتیلی سے ملی جائیں وہ آنکھیں دیکھو
مے لو ہیں بھرتے ہیں اس طرح کے پیمانوں میں

ادھر دل پہ بجلی گرائی ادا نے
ادھر مطمئن ہو کے لوٹا حیا نے

کہا تھا کہ وعدے ہیں اے دل بہانے
مگر جب تو میری کوئی بات مانے

شکار انگنوں کی یہ مشکل پسندی
اڑاتے نہیں بال باندھے نشانے

بھلانا جو چاہا تو یاد اور آئے
وہ عشرت کے لمحے وہ بیتے زمانے

نشاں جب نہ پایا کسی بے نشاں کا
گڑھے شوق سجدہ نے خود آستانے

کوئی سن بھی لے تو سمجھتا نہیں ہے
کہ راہیں نئی ہیں نئے ہیں ترانے

کبھی زیر لب ہم نے کچھ کہہ دیا تھا
بنا ڈالے دل نے ہزاروں فسانے

ذرا رنگ رخ دیکھیے آئینے میں
چلے ہیں محبت مری آزمانے

کہا لاکھ لیکن اثر تم نہ سمجھے
کیا اور خود بیں اسے التجا نے

نہ تو ہندو کوئی دیکھا نہ مسلماں دیکھا — میں نے انساں کی نظر سے سوئے انساں دیکھا

غیرتِ عشق نے مارا اُسے رُسوا کر کے — جس نے بھی تجکو جفاؤں سے پشیماں دیکھا

اتنے وعدے کئے کافر نے کہ ایفا ہی محال — وعدے سے پھرنے کا جب اُدھر نہ امکاں دیکھا

لکھنے بیٹھے تو یورش ہو گئی ارمانوں کی — نامۂ شوق کو عنوان ہی عنواں دیکھا

ہوئی دم بھر جو خوشی بھی دلِ غمدیدہ کو — گرد آلودہ سوا آئینۂ جاں دیکھا

تم کو تجدید میں پیماں کی تامل کیوں ہے — جو نہ ٹوٹا ہو نہ ایسا کوئی پیماں دیکھا

پھر بھی امید وفا ہے دلِ سودائی کو — وعدہ کر کے اُسے سو بار پشیماں دیکھا

کو بکو جس کے تجسّس میں رہے سرگرداں — خانۂ دل میں اُسی شوخ کو مہماں دیکھا

ذرّے ذرّے پہ دھڑکتے ہوئے دل کا تھا گماں — وحشیوں نے ترے ایسا بھی بیاباں دیکھا

اُسکی برگشتہ مژہ دل میں کھٹکتی ہی رہی
شوقِ پیکاں میں آخر شوق کو پیکاں دیکھا

اب اس طرح دلِ غمکش ہمیں ستاتا ہے — کہ بات بات پہ رونا چلا ہی آتا ہے

نصیب ہو نہیں سکتا بغیر پاکئ نفس — وہ عشق حُسن کے دل میں جو راہ پاتا ہے

نسیمِ صبح کا جھونکا ہے یا خیال ترا — جو دل کے سوئے ہوئے نغموں کو جگاتا ہے

پلک سے اشک ٹپکتا ہے یوں سرِ دامن — ستارۂ سحری جیسے ڈوب جاتا ہے

ستم کے بعد تلافی ستم کی ہنس ہنس کر — کسی غریب کو یوں بھی کوئی ستاتا ہے

ستارے ہیں کہ جبیں پر چُنی ہوئی افشاں — نگارِ شب کو سنورنا تو ہی سکھاتا ہے

مآل کارِ محبت نہ جانے کیا ہوگا
نہ اُس کو رحم نہ دل کو قرار آتا ہے

کسی کی یاد اب آتی ہے اس طرح دل میں
ستارہ جیسے سرِ شام جھلملاتا ہے

خوشی تو کیسی تصور سے عیشِ فرقت کے
دلِ شکستہ کا ہر تار تھرتھراتا ہے

مذاقِ عشق میں کہتے ہیں دل اُسی کو اثرؔ
ذرا سی ٹھیس جو لگتے ہی ٹوٹ جاتا ہے

کہیں لینے جانا ہے بے جرم خواری
ترا فیض جب تک ہو اے عشق جاری

کبھی ہم تھے مشہور اہلِ نظر میں
سحر کے مغنی صفا کے پجاری

بھلانا جو چاہا تو یاد اور آئیں
لگاوٹ کی باتیں تری پیاری پیاری

محبت میں دم بھر نہ آرام پایا
وہی سینہ چاکی وہی دل فگاری

کوئی مہرباں ہو کہ نامہرباں ہو
وہی اشک باری وہی بے قراری

بتاؤ تمھیں کیا ہے اُس کا مداوا
جسے راس آجائے ناسازگاری

جگر میں تلاطم لبوں پر تبسم
محبت پہ ہے ختم یہ پردہ داری

ابھی تو نہیں جب اثرؔ ہم نہ ہوں گے
بہت یاد آئیں گی باتیں ہماری

کہنے کو میکش بہت وہ بزمِ رندانہ کہاں
مستیاں جس سے چھلکتی ہوں وہ پیمانہ کہاں

قیس کی صحرانوردی بازیٔ طفلانہ تھی
دل کے ویرانے سے بڑھ کر کوئی ویرانہ کہاں

آپ سے بیگانہ یعنی آشنا ہو آپ سے
اور اس دنیا میں اپنا یا کہ بیگانہ کہاں

اضطرابِ شوق کی معجز نمائی دیکھنا — شمع کا شعلہ کہاں آغوشِ پروانہ کہاں
اک خلش زارِ تمنا ہی جسے کہتے تھے دل — اب خیالاتِ جنوں کا وہ پری خانہ کہاں
دل میں اک موجِ طرب اٹھتی تھی بل کھاتی ہوئی — اب تری مخمور آنکھوں میں وہ افسانہ کہاں

اس قدر مستِ خیالِ نرگسِ مخمور ہو
مست بھی پوچھیں اثرؔ ہو تیرا میخانہ کہاں

قفس میں کچھ خبرِ گلستاں نہیں معلوم — بہار ہے کہ خزاں حکمراں نہیں معلوم
سوائے نام کے تیرا نشاں نہیں معلوم — کہاں جھکاؤں جبیں آستاں نہیں معلوم
ہماری ہی تگ و دو کا غبار چھایا ہے — جو یہ نہیں تو ہے کیا آسماں نہیں معلوم
حیات و مرگ کا طوفاں نفس نفس میں ہے — کہاں پہ دم لے یہ موجِ رواں نہیں معلوم
یہ چاہتے ہیں بدل دیں نظام فطرت کا — جنھیں خود اپنا ہی سود و زیاں نہیں معلوم
ترے خیال کی رعنائیوں میں گم کیا ہو — جسے کہ عشق کا رازِ نہاں نہیں معلوم
یقیں گماں ہو کبھی تو کبھی گماں ہے یقیں — مآلِ کار یقین و گماں نہیں معلوم
نہ ہو قفس سے جو مانوس کیا کرے وہ غریب — جسے قفس کے سوا آشیاں نہیں معلوم
نیازِ عشق ہے نا آشنائے حسنِ طلب — اب اس قدر بھی تمھیں مہرباں نہیں معلوم

اثرؔ امیدِ وفا اور ایسے کافر سے
جنھیں نہیں کے سوا ہاں نہیں معلوم

کس طرح کھلتے ہیں نغموں کے چمن سمجھا تھا میں — سازِ ہستی پر تجھے جب زخمہ زن سمجھا تھا میں

گل سے گل پرخاش پر آمادہ جب ہونے لگے
شعلوں سے ترتیب پائیگا چمن سمجھا تھا میں

کیا خبر تھی ہمنوا ہو جائیں گے صیاد کے
باغ کا اپنے جنھیں سرو و سمن سمجھا تھا میں

اب کھلا دونوں میں باہم کوئی نسبت ہی نہیں
بوئے گل کو تیری بوئے پیرہن سمجھا تھا میں

انجمن میں لطف تنہائی نہ تھا جبتک نصیب
اپنی تنہائی کو رشک انجمن سمجھا تھا میں

توبہ توبہ تو کہاں وعدہ کہاں ایفا کہاں
دل رُبائی کا ہے یہ بھی ایک فن سمجھا تھا میں

حق و باطل کا اثر مٹنے لگا جب امتیاز
تازہ ہوگا قصۂ دار و رسن سمجھا تھا میں

سنہ ۱۹۵۵ء

پھوٹیں گے انقلاب کے دھارے نئے نئے
ڈھونڈیں گے دردمند سہارے نئے نئے

اے محوِ خوابِ عشرتِ دوشینہ دیکھ تو
تابندہ ہیں اُفق پہ ستارے نئے نئے

کیف و کمِ حیات کے حلقے سے تو نکل
عالم نئے نئے ہیں نظارے نئے نئے

طوفاں سے کھیلنا اگر انسان سیکھ لے
موجوں سے آپ اُبھریں کنارے نئے نئے

تہ پائیے جو بات کی اُس کے تو کس طرح
رمزیں نئی نئی ہیں اشارے نئے نئے

منکر خدا کے بندۂ اوہام بن گئے
پوجا کو بُت خراد اُتارے نئے نئے

انسان کی مغائرت انساں سے ہے جو تھی
میدان مارنے کو تو مارے نئے نئے

تہذیب کی ہوا بھی جنہیں چھو نہیں گئی
پیدا ہوئے ہیں راج دُلارے نئے نئے

اپنے جو تھے آخر وہی اپنے نہیں رہے
ہوتے ہیں امتحان ہمارے نئے نئے

عرض نیاز عشق کا سودا لئے ہوئے
دل ہے ہزار داغ تمنا لئے ہوئے

پھر پھیلا ہے سوئے درِ دوست اضطراب
صدہا سجود ناصیہ فرسا لئے ہوئے

پھر دل میں جوش زن ہے وہ طوفانِ آرزو — جس کی ہر ایک موج ہے دریا لئے ہوئے

بیٹھا ہوا ہوں میکدۂ انتظار میں — لبریز شوق ساغر و مینا لئے ہوئے

جب تیری یاد آتی ہے آتی ہے اس طرح — جیسے نسیم بوئے سمن سا لئے ہوئے

سرگشتۂ دشتِ شوق میں اب تک خیال ہے — ہمراہ کاروانِ تمنا لئے ہوئے

آوارہ چار سو ہے کسی کی تلاش میں — اک مشتِ خاک وسعتِ صحرا لئے ہوئے

اُن مست انکھڑیوں نے بھرا اس قدر سرور — اک تھرتھری ہے موجۂ صہبا لئے ہوئے

یہ بھی ہے زندگی میں کوئی زندگی کہ ہم — ماضی میں جیتے ہیں غمِ فردا لئے ہوئے

آئینہ دارِ حسن ہے ہر اشکِ خوں اثر
رنگینیٔ بہار تماشا لئے ہوئے

بے قراری کبھی قرار میں ہے — کبھی آسودگی فشار میں ہے

آس جب تک ہے تیرے آنے کی — پھول آغوشِ انتظار میں ہے

شوق رسوا ہی کر کے چھوڑے گا — کوئی جیسے مرے کنار میں ہے

اُس سے بڑھ کر ہے سادگی تیری — جتنی مشاطگی بہار میں ہے

ہر نفس ہے نشاط سے لبریز — ترکِ حبِ وطن سے اختیار میں ہے

نام سے اُسکے کانپتی ہے اجل — عشق آوارہ جس دیار میں ہے

جس سے مستانہ وار گزرا عشق — مستی اُس راہ کے غبار میں ہے

سینہ کاوی کے ساتھ ساتھ اثر — ایک لذت بھی انتظار میں ہے

جب نظر سوئے ذات جاتی ہے — تا محیط صفات جاتی ہے
ہستی ہوتی ہے اتنی ہی مبہم — جتنی بھی دور بات جاتی ہے
چھوڑ جنت کی فکر اے زاہد — عشرت ممکنات جاتی ہے
جو گزرتی تھی زیر سایۂ زلف — اب وہ آنکھوں میں رات جاتی ہے
کچھ جو کہئے تو ایک آفت آئے — چُپ جو رہیئے تو بات جاتی ہے
جس کو آنا ہے وہ نہیں آتا — رات آتی ہے رات جاتی ہے
سخت پُر پیچ و خم وہ راہیں ہیں — جن سے ہو کر حیات جاتی ہے
جس طرف آپ کے ہوں نقش قدم — اُس طرف کائنات جاتی ہے
ساتھ ہے حسرتوں کا ایک ہجوم — زندگی کی برات جاتی ہے

زندگی کا آخر الم کیسا،
شے تھی اک بے ثبات جاتی ہے

متفرقات

موج بادہ رنگیں ہو اتنی کہاں رنگیں ——— اُسکے لعل لب دیکھو جب وہ مسکراتا ہو

کبھی جو آئینہ دل کی حقیقت ہو گئی ہوتی ——— تمھیں میری محبت سے محبت ہو گئی ہوتی

اُسکے آنے سے ٹھہر جاتا تھا دل ——— آج آکر اور بھی تڑپا گیا

درس عبرت جو حوادث تھے پئے اہل نظر ——— وہ سُنے ہم نے تو اک نیند کا جھونکا آیا

راز و نیاز ہوتے ہیں کس سے تمام رات ——— ملتا نہیں مزاج گلوں کا سحر کے وقت

دست بیداد خزاں چھو نہیں سکتا جن کو ——— پھول کچھ ایسے بھی میرے چمنستاں میں ہیں

جو تبسم میں کسی کے تھی تبسم سے الگ ——— اپنے اشکوں میں وہی تابندگی پاتا ہوں میں

جو زباں سے ادا نہ ہو سکتا ——— وہ فسانہ سُنا گئیں آنکھیں

چمن کی سیر بہت کی ادھر بھی ایک نظر ——— شکست رنگ سے رشک بہار ہم بھی ہیں

وہ تشنہ کام ہوں کہ یہ اکثر گماں ہوا ——— موجوں کا اضطراب ہی ساحل کہیں نہ ہو

آزردگی اثر کی اُس بیوفا سے کب تک ——— کچھ دن کھنچے رہیں گے پھر التجا کریں گے

اُس کو الزام ذرا سوچ سمجھ کر دینا ——— دیکھنا اپنی ہی تقصیر نکل آئیگی

ساری ادائیں مختلف پھر بھی تمام سب آفریں ——— جیسے کہ ایک گیت میں سُر ہوں کئی ملے جُلے

محبت بے نیاز فکر درماں ہوتی جاتی ہے ——— بحمداللہ یہ مشکل بھی آساں ہوتی جاتی ہے

آرزو ہے کرم یا ستم بیگانہ ہوں ——— کہ صلہ آپ ہی اپنا ہے محبت میری

شورش نوائی دل زتہار کم نہ ہوگی ——— اس انجمن میں جب تک وہ جان انجمن ہے